

# قطرہ قطرہ قلمزم

واصف علی واصف





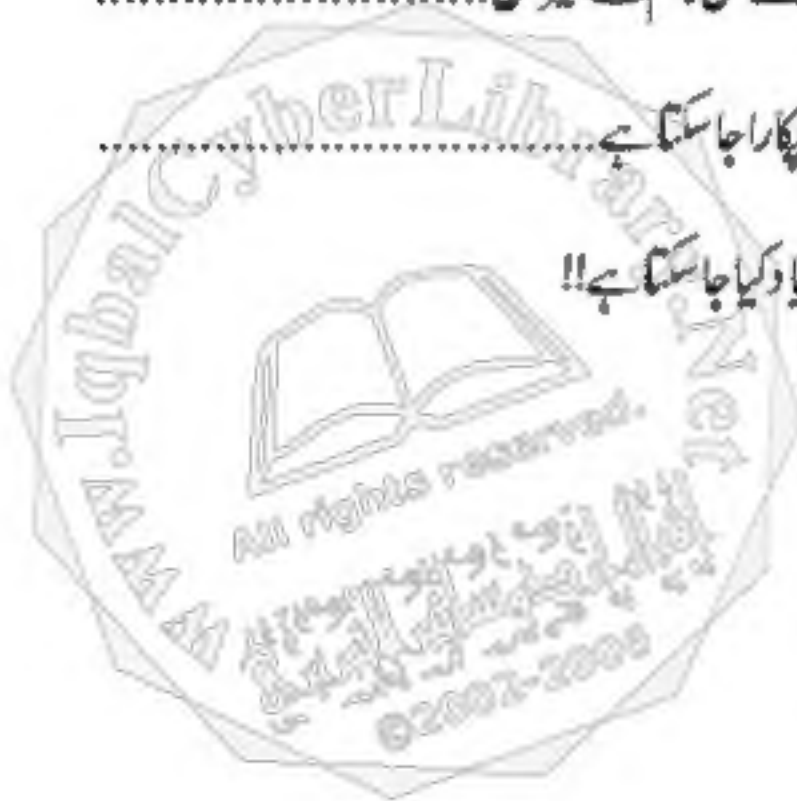
اس کے نام.....

جس کے سب نام ہیں.....

جسے کسی نام کے بغیر بھی.....

پکارا جاسکتا ہے.....

یا دکیا جاسکتا ہے!!



فہرست مندرجات

05	گر قبول افتد
12	۱۔ زندگی
18	۲۔ توبہ
25	۳۔ موتی
32	۴۔ تقرب الہی
38	۵۔ تقرب الہی (۲)
44	۶۔ محبوب
49	۷۔ فراق و وصال
54	۸۔ دکھیا سب سنساز
59	۹۔ خوف اور شوق
64	۱۰۔ بات سے بات
72	۱۱۔ قلم
77	۱۲۔ کرب ہی کرب
81	۱۳۔ رفعت خیال
87	۱۴۔ بارِ تسلیم
92	۱۵۔ معمولی بات
96	۱۶۔ گمانوں کا شکر، یقین کا ثبات
103	۱۷۔ مذہب
109	۱۸۔ مفروضے، اندازے اور مجبوریاں

113

۱۹۔ ماضی، حال اور مستقبل

119

۲۰۔ بلا سبب

123

۲۱۔ پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں

128

۲۲۔ گردش تیز ہے ساقی

134

۲۳۔ سوال یہ ہے کہ؟

141

۲۴۔ ہم کیا ہیں؟

149

۲۵۔ عذاب

155

۲۶۔ مصروفیت

160

۲۷۔ منفعت

167

۲۸۔ تعریف

171

۲۹۔ خاموشی

176

۳۰۔ پریشانی

182

۳۱۔ مجبوری

188

۳۲۔ جمہوریت

192

۳۳۔ خطرہ

198

۳۴۔ قیادت

203

۳۵۔ ذرے میں صحرا

208

۳۶۔ موت کا خوف

212

۳۷۔ عاجزی

219

۳۸۔ لب پہ آسکتا نہیں

228

۳۹۔ یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر





ہے، قلم سے دوری اس کی فنا ہے۔ قلم اس کی زندگی کا ماخذ ہے، اور ماخذ سے کٹ کر زندگی زندہ نہیں رہ سکتی..... قطرہ ہزار شبنم بنے ہزار آنسو بنے، اشک ندامت ہو کہ نوک خار پر رقص کرنے والا قطرہ اپنے منفرد وجود میں موجود نہیں رہ سکتا..... سورج کی چشم عنایت سے پہلے ہی شبنم فنا ہو چکی ہوتی ہے، بہر حال اگر قطرہ وصال بحر سے محروم ہو تو وہ قطرہ ہی نہیں رہ سکتا، اس کا وجود جس ذات کا مرہون احسان ہے، اسی کسیدم سے ہی قائم رہ سکتا ہے، نہیں تو نہیں.....

تجرب کی بات ہے، کہ اگر قطرہ وصال بحر حاصل کر لے تو بھی وہ نہیں رہ سکتا..... سمندر میں شامل ہو کر قطرہ تو قطرہ نہیں رہے گا..... سمندر بن جائے گا..... ہزار بار بن جائے..... وہ قطرہ نہیں رہے گا..... وہ جو تھا..... نہ رہا..... اب اور کیا بن گیا؟ سمندر نے قطرے کو ہمکنار کیا، آغوش رحمت میں لے لیا، اسے وسعت بیکراں عطا کر دی..... اس کا اصل اس پر آشکار کر دیا، اس پر ایسا حال طاری کیا، کہ اس کا ماضی اب اس کا حال ہی نہیں مستقبل بھی ہے..... اصل سے جدا ہو کر اسل میں ملنا بیڑی بات ہے۔

لیکن فراق میں قائم رہنے والا قطرہ وصال میں بکھر گیا..... منتشر ہو گیا..... پھیل گیا..... سمندر بن گیا..... اوریوں اپنی ذات سے فنا ہو کر کسی اور ذات میں بقا پا گیا.....

ہر دو حالت میں قطرہ قطرہ نہیں رہ سکتا، یہ وجود ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا..... یہ قلم کا فیض ہے..... وہ فراق عطا کرے تو قطرہ فراق کی آگ میں سلگتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے، اور اگر وہ وصال عنایت فرمائے تو بھی قطرہ اپنی ذات سے نکل کر ذات محبوب میں گم ہو جاتا ہے۔ گم ہو جانا تو قطرے کا مقدر ہے ہی

نہی،..... کیوں نہ وہ منزل اور راستے میں گم ہو، بے راہ راستوں میں گم ہونے والے دونوں جہاں میں خسارہ پا گئے، خسارہ کیا ہے، نفع کیا ہے..... یہ بہت لمبی بات ہے..... چند روزہ زندگی میں یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کہ اصل کیا ہے؟ سود کیا ہے؟ نفع کیا ہے؟ ضرر کیا ہے؟ یعنی نقصان کیا ہے، ہونا کیا ہے؟ نہ ہونا کیا ہے؟ اور کیا ہونا نہ ہونا بھی ہو سکتا ہے؟..... کیا ہم واقعی ہی ہم ہیں..... ہم کب سے ہیں..... کب تک ہیں..... اور کیوں ہیں..... کیا قطرہ فنا سے ڈر کر بھاگ رہا ہے، یا یہ فنا کے تعاقب میں بھاگ رہا ہے، وہ جو فانی ہوئے، ان کو نکال کر باقی کی ہستی کیا ہے..... اور وہ جو باقی سے واصل ہوئے، ان کے بغیر کیا باقی کا وجود نہیں رہتا..... سب کچھ سب کے بغیر رہ سکتا ہے تو یہ سب کچھ کیا ہے.....؟

یہی وہ سوال ہے، جس کی تلاش میں سفر کے دوران، انسان کو نئے سوالات سے آشنائی ہوتی ہے، اور پھر نئے جوابات کے حصول کا سفر ایک اور حقیقت سے آشنا کراتا ہے..... محدود زندگی میں لامحدود گوشوں کی دریافت، اک عجب حال ہے..... اتنی وسیع و عریض، جمیل و عظیم، ظاہری اور باطنی کائنات کے حسین اوراق کا مشاہدہ، اور مطالعہ کرنے کے لئے اتنے مختصر ایام..... کیا کیا جائے..... نظر محدود ہے، اور نظارے لامحدود.....

صاحبان فکر و نظر آتے ہیں، اور بیان کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں..... کائنات جوں کی توں رہتی ہے، اس کے ایک گوشے کے کسی ایک حصے کا بیان بھی مکمل نہیں ہو سکتا،..... اور ابھی نہ جانے کیا کیا ہے لکھنے والا.....

اگر سمندر سیاہی بن جائیں، اور درخت قلم ہو جائیں، تو بھی بیان نہیں کر سکتے، اس کی شان اور تسبیح، جو اصل کائنات ہے، مالک کائنات ہے، خالق کائنات

ہے..... یہ بیان ممکن ہی نہیں..... حسن بیان عطا ہو جائے تو بھی حق بیان ممکن نہیں.....

قطرہ اپنے اندر قلم و دیکھے، یا قلم کے اندر جا کر اپنا جلوہ دیکھے.....

حقیقت حال کو بیان نہیں کر سکتا..... قطرہ قطرہ قلم ہو جائے تو بھی قلم بیان میں نہیں آئے گا..... ہزار مضامین لکھو، بات بیان ہی نہیں ہو پا رہی..... ہزار ہا لائبریاں..... علم کے چراغ..... اخباروں کے کالم..... مبلغین کی خیال آرائیاں..... مشائخ کرام کی طریقتیں اور طور طریقے.....

سیاست دانوں کی تقریریں اور تحریریں اور کوششیں، اور نہ جانے کیا کیا..... اور پھر حکمرانوں کے احکامات، پس..... حکم ہی حکم..... یہ سب کوششیں ہیں، حقیقت آشنائی کے انداز..... اور پھر حقیقت بیان سے باہر، ہمیشہ ہی بیان سے باہر.....

وسعت بیان مل بھی جائے تو بھی بیان وسعت ممکن نہیں..... بس صرف رونق ہے..... صرف جلوہ ہے..... دیکھنے والا منظر..... غور والی بات، حاصل صرف فنا ہے، صرف اور صرف فنا.....

میرے بعد کیا ہوگا..... تجھ سے پہلے کیا تھا؟

میں اس کو نہیں مانتا..... تجھے کون مانتا ہے

میں علم تک پہنچ گیا..... جہالت سے کب جدا ہوئے ہو؟

میں سب کو فتح کر لوں گا..... فتح کرنے کی خواہش ہی کو فتح کر لو،



میں ہمیشہ رہوں گا..... کس کے لئے.....؟ ہم جس کے لئے بھی رہو گے، وہ ہمیشہ نہیں رہ سکے گا،

میں کامیابی کا راز جانتا ہوں..... تم سے پہلے جو لوگ یہ راز پانگے تھے، وہ کہاں گئے؟ بہر حال یہ کہانی ختم نہیں ہو سکتی..... نہ کوئی معیار آخری ہے، نہ کوئی اسلوب انتہائی..... لائبریری سے باہر بھی علم ہے..... اور علم سے باہر بھی علم ہے..... ایک جاننے والا دوسرے جاننے والے سے بے خبر بھی ہو سکتا ہے، ہم خود کو معیار سمجھتے ہیں، اور دوسروں کو مارتے رہتے ہیں، ان کی خوبیاں اور خامیاں دریافت کرتے رہتے ہیں..... ہم خود دوسروں کی زد میں ہیں..... دوسرے اپنے، اپنے معیار رکھتے ہیں،..... کوئی معیار آخری نہیں..... کوئی راز انتہائی نہیں.....

یہ سارا منظر موجود نظر کا مرہون ہے..... آج کی کائنات ہی آج کے انسان کی ہے..... کائنات انسان کی دسترس میں ابھی آیا چاہتی ہے، اور انسان کائنات کی گرفت میں آ بھی چکا ہے..... قطرہ قلم کے رویہ وہی نہیں، دو بدو بھی ہے..... اور نتیجہ کیا ہو گا، سوائے اس بات کے کہ قطرہ قلم نہ رہے گا..... قلم پر لازم ہو گا، وہ اپنی ہستی کے محسن و ماخذ پر نظر رکھے..... وہ اپنے محبوب، مونس، اور غمگسار مالک سے رابطہ رکھے،..... وہ کائنات اور کائنات کے خالق کو سمجھے، وہ اپنے اصل اور اپنے محبوب قلم کی لگن میں رہے..... یہی اس کی ہستی کی اساس ہے.....

اگر جز ہی خود شناس ہو جائے تو اسے کل شناس بننے میں دیر نہیں لگتی..... وقت تو صرف اس بات کی ہے، کہ انسان خود شناسی سے گریزاں رہتا ہے، وہ کائنات آشنائی کے سفر پر روانہ رہتا ہے، اور خود سے نا آشنا، خود سے جدا، خود

سے بیگانہ، اپنے آپ سے اجنبی ہی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم کی بہتات میں بھی جہالت کی کارفرمائی قائم رہتی ہے..... ہم سب کچھ جانتے ہیں، سب کچھ پہچانتے ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے، کہ ہم کون ہیں..... ہم کو کس نے اس جہان اجنبی میں نامعلوم مسافتوں پر روانہ کر رکھا ہے..... اور پھر ہمیں عین سفر کے دوران اور سفر کے درمیان واپس بلا لیا جاتا ہے..... اگر جانا ہی تھا تو پھر آنا کیا تھا؟

یہی عجب بات ہے..... کہ فانی ہی باقی کا آئینہ ہے، کرنیں نہ ہوں تو سورج کا جلوہ کیا ہے؟ قدیم کا ذکر صرف حادث ہی کی زبان سے سنا گیا ہے، انسان فانی ہے لیکن وہ باقی کی دھن میں ہے۔ اللہ باقی ہے، لیکن وہ فانی ہی کو تخلیق فرماتا ہے، اسی فانی سے محبت کرتا ہے، اسی کے خیال میں رہتا ہے..... خالق اور مخلوق دونوں ایک دوسرے کے خیال میں رہتے ہیں..... عقل کا حجاب اٹھ جائے تو جلوہ کچھ اور ہی ہے، باقی کی محبت فانی کیسے ہو سکتی ہے، باقی کا محبوب باقی ہی ہوگا! بہر حال قلم کے جلوے، قطروں کے جلوئے ہیں..... نقش و نگار کی کثرت، دراصل وحدت ہی کے جلوئے ہیں.....

خیال ایک وسیع قلم ہے، صاحب خیال کی تخلیقات قطروں کی طرح ہیں..... قطرہ قطرہ تقسیم ہونے کے بعد بھی قلم تو قلم ہی رہتا ہے..... اس کی وسعتوں کو کچھ فرق نہیں پڑتا..... خیال بیان ہو کر بھی بیان نہیں ہوتا..... سمندر سے دس دریا نکال لیے جائیں تو بھی وہ جوں کا توں ہے، اور اگر اس میں دس دریا شامل کر دیئے جائیں تو بھی وہ جوں کا توں ہی رہتا ہے، یہ صرف احساس کی بات ہے..... تسلیم کی بات ہے..... ورنہ کہاں قطرہ اور کہاں قلم..... قطرے کا وجود عطائے قلم ہے۔ اور قلم کا وجود اورائے قطرہ ہے.....

مصنف اپنے مضامین کو اپنی تخلیق سمجھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ وہ خود ہی اپنی تصنیف کا خالق ہے۔۔۔۔۔ دراصل خیال کا خالق وہی ہے، جو انسان کا خالق ہے خیال جب چاہے، جہاں سے چاہے نمودار ہو جائے۔۔۔ جس زبان سے چاہے بیان ہو جائے، جس قلم سے چاہے رقم ہو جائے،۔۔۔۔۔ اس نے ان مضامین کو خالق خیال کا احسان مانتے ہوئے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ وہ چاہے تو صبح سے چشمہ بھونٹے، وہ چاہے تو نچر سے ابلدہ بھونٹے، وہ چاہے تو تاریک جگہ گانے لگے، وہ چاہے تو انسان کو بیان کی دولت عطا ہو جائے، وہ چاہے تو معصیت، مغفرت میں بدل جائے، وہ چاہے تو سرنگوں سرفراز ہو جائے۔۔۔۔۔ وہ چاہے تو یہ کتاب اسی کے نام کر دی جائے۔۔۔۔۔ قطرہ اپنی ہستی اور اپنی ہستی کی بے نیگی کے سوا قلم کو کیا پیش کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ پس اپنی تخلیق اپنے خالق کے نام!

## زندگی

زندگی کسی میدان کارزار کا نام نہیں۔۔۔ یہ جلوہ گاہ ہے۔۔۔ حسن کی جلوہ گاہ۔۔۔ یہ ایک بارونق بازار ہے۔۔۔ جس میں سے خریدار گزرتا ہے۔۔۔ وہ خریداری کرتا ہے۔۔۔ اور اس کا سرمایہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر تعجب ہے کہ اس کی خریداری بھی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔۔۔ وہ خالی ہاتھ واپس لوٹتا ہے۔ رونق بازار قائم رہتی ہے اور خریدار ختم ہوتے رہتے ہیں۔۔۔ زندگی کسی الجھے ہوئے سوال کا نام نہیں۔ یہ ایک پر لطف منظر ہے۔ ایسا لطیف منظر کہ تبصرے اور تنقید کے بوجھ کو بھی برداشت نہیں کرتا۔۔۔ یہ ایک دیکھنے والا منظر ہے۔۔۔ ایک سننے والا نغمہ ہے۔۔۔ ایک سوچنے والا منصوبہ نہیں۔۔۔ ایک مشکل معرکہ نہیں۔۔۔ زندگی تو بس زندگی ہی ہے۔۔۔ کسی کا حسن ہے۔۔۔ کسی کی دین ہے۔۔۔ کسی اور کا عمل ہے۔۔۔

یہ سمندر کی طرح ہے۔۔۔ وسیع و بے پایاں۔۔۔ جس کا صرف ایک ہی کنارہ ہے۔ ایک ساحل جہاں رونقیں ہیں۔ میلے ہیں۔ چراغاں ہے، ہجوم ہے، تنہائیاں اور اداسیاں بھی ہیں۔ دوسرے کنارے کی کسی کو خبر نہیں۔۔۔ جو لوگ دوسرے کنارے کی خبرینے لگے، ابھی تک لوٹے نہیں۔۔۔ اس طرف رنگ ہی رنگ ہیں۔ اور دوسری طرف بے رنگ۔۔۔ صرف ایک ہی رنگ۔۔۔ کان جانے کہ اس سمندر میں کیا ہے۔ اور اس کے پار کیا ہے؟۔ یہاں میلا ہے اور پھر ہر انسان اکیلا ہے۔۔۔ زندگی کب سے ہے اور کب تک ہے۔ کون جانے ازل سے ابد تک۔۔۔ یا ازل سے پہلے اور ابد کے بعد بھی زندگی ہے۔ تخلیق ہونے سے پہلے یہ خالق کے ارادے میں زندہ تھی۔ اور تکمیل کے بعد بھی یہ خالق کے روبرو حاضر کر دی جائے گی۔ زندگی



بہر حال زندگی ہی رہے گی،

زندگی وقت کھاتی ہے۔۔۔ زمانے نکل جاتی ہے۔ کبھی، کبھی صدیوں  
بڑپ کر جاتی ہے۔ اور ٹس سے مس نہیں ہوتی۔۔۔ اور کبھی، کبھی ایک لمحے میں  
انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ بہر حال زندگی زندگی ہی رہتی ہے۔۔۔ ایسے کیسے یہ اپنے  
سمندر کا ہی ایک جزیرہ ہو۔۔۔ زندگی سے پہلے بھی زندگی تھی اور زندگی کے بعد بھی  
زندگی ہوگی۔ زندگی مرنی نہیں مر سکتی نہیں۔ نہ ہی یہ ہمیشہ زندہ رہ سکتی ہے۔ زندگی  
ہمیشہ قائم بھی ہے اور ہمیشہ تبدیل بھی ہوتی رہتی ہے۔

زندگی جہاں پھلنے پھولنے کا نام ہے، وہاں اپنی آگ میں جلنے کا نام بھی  
ہے۔ زندگی تخلیق کرتی ہے اور اپنی تخلیق کے مراحل میں تحلیل بھی ہوتی رہتی ہے۔  
اس طرح زندگی ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہی رہتی ہے، جلتی بجھتی زندگی بس  
امید و یاس میں رہتی ہے۔ یہ سفید و سیاہ دھماگے سے بنا ہوا خوبصورت دیو ہے۔  
اس میں بہت کچھ ہے، اس قہقہے بھی ہیں۔ اور ہچکیاں اور سسکیاں بھی۔

زندگی غریبوں کے کپے گھروندوں میں بھی سرشار رہ سکتی ہے۔ اور امیروں  
کے کپے محلات میں جا رہی رہ سکتی ہے۔

زندگی اگر چاہے تو گردش حالات سے منسوب ہو جاتی ہے۔ اور اگر پسند  
فرمائے تو گردش زمان و مکان سے بے نیاز ہو کر اپنے لیے نئے جہاں پیدا کر تی  
ہے۔

زندگی کسی فارمولے میں مقید نہیں ہو سکتی۔ اسے کچھ کہہ بیجیے، یہ سنتی ہے  
مسکراتی ہے۔ اور کچھ اور ہی روپ اختیار کر کے فارمولے سے باہر نکل آتی ہے۔

اگر زندگی کو مسلسل سفر کہا جائے تو مکمل قیام کیا ہے؟

اگر زندگی کو بیداری کہا جائے تو نیند اور غفلت کو کیا کہا جائے۔

اگر زندگی کو محبت کہہ لیا جائے تو نفرت بھی تو زندگی ہے۔ بلکہ نفرت زیادہ زندہ ہے، نفرت غصہ، حسد، انتقام زندگی کو زیادہ متحرک رکھ سکتے ہیں۔ بہر حال صحت اور نفرت زندگی کے ہی نام ہیں۔

اگر مذہب کو زندگی مان لیا جائے تو لاد مذہبیت کیا ہے۔

اگر زندگی زمین ہے تو آسمان کیا ہے، اگر مخلوق کو زندہ کہا جائے تو مخلوق پیدا کرنے والی ذات کو کیا کہا جائے۔ زندگی کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ اسے جاننا اور پہچاننا بھی مشکل ہے۔ یہ ایک راز ہے، ایسا راز کہ جس نے راز جان لیا وہ مر گیا۔ اور جو نہ جان سکا وہ مارا گیا۔

زندگی تلاش میں ہے، کس کی تلاش۔۔۔ زندگی اسے تلاش کرتی ہے جو اسے تلاش کرتا ہے۔ زندگی موت کے تعاقب میں ہے۔ اور موت زندگی کے پیچھے آرہی ہے۔ دونوں، دونوں کی تلاش میں ہیں، جب تک دونوں میں سے ایک ختم نہیں ہو جاتا یہ کھیل جاری رہتا ہے۔۔۔ یعنی نور اور ظلمات کا کھیل۔ ہونے اور نہ ہونے کا کھیل۔ ماننے اور نہ ماننے کا کھیل۔ دن اور رات کا کھیل۔

زندگی کے دامن میں بے پناہ اور بے شمار نعمتیں ہیں۔ اس میں خوشیاں اور حسرتیں ہیں۔ امیدیں ہیں مایوسیاں ہیں۔ صداقتیں ہیں، دھوکے ہیں۔ میسے ہیں اور تنہائیاں ہیں۔

زندگی سمندر ہے۔ اپنے بادلوں کو نا معلوم سفر پر روانہ کرنے والے۔ انہیں الوداع کہنے والا۔ اور پھر یہی سمندر اپنے مسافروں کو، اپنے دریاؤں کو خوش آمدید کہنے والا بھی ہے۔

زندگی، زندگی سے نکل رہی ہے۔ زندگی میں زندگی شامل ہو رہی ہے۔ زندگی سے زندگی جدا ہو رہی ہے۔ زندگی سے زندگی واصل ہو رہی ہے۔

دراصل زندگی تو زندگی ہے۔ فراق و وصال سے بہت بند۔۔۔۔۔ حاصل و محرومی سے بہت بے نیاز۔ اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر۔ لیکن غیر متاثر۔۔۔ زندگی بہت پرانی ہے، بہت قدیم ہے، بہت بوڑھی ہے۔ لیکن یہی زندگی بہت جدید ہے۔۔۔ بہت نئی ہے اور بہت جوان ہے۔

ہر قدیم کبھی جدید تھا۔ اور ہر جدید کبھی قدیم ہوگا۔

یوں یہ زندگی بیک وقت قدیم اور جدید ہے۔ پرانے شہر اور نئے انسان۔ پرانے انسان اور نئے شہر۔۔۔ آج کا انسان پرانے کھنڈرات میں خوش رہتا ہے۔ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کون لوگ تھے۔ جو اس کھنڈر میں کبھی آباد تھے۔ یہ کھنڈر کبھی محلات تھے۔ نیا انسان پرانی کائنات کو دریافت کرنے نکلا ہے۔ وہ اسے ترقی کہتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آج کا انسان آج بھی پرانی طرز پر پیدا ہوتا ہے۔۔۔ پرانے مصنفین کو پڑھتا ہے۔ اور نئے علم کا اظہار کرتا ہے۔ نئی بات کیا ہے۔ پرانے چہرے ہیں۔ پرانی آنکھیں ہیں۔ پرانے آنسو ہیں۔ وہی کچھ ہے جو تھا۔ اور پھر نئے نئے نئے کے لیے پرانی منزل۔۔۔ پرانے قبرستان۔۔۔۔۔ یہ سب باتیں سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ یہ سب زندگی ہے۔ برات بھی زندگی اور جنازہ بھی زندگی۔۔۔ سمجھنا





نام ہے۔ اپنے سے قریب ہو نیک نام ہے۔ اپنے سے آشنا ہونے کا نام ہے۔ اپنا ہی نام ہے۔ میں ہی زندگی ہوں۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں تسلیم کروں کہ تو بھی زندگی ہے۔ اور وہ بھی زندگی ہی ہے۔ سب کا احترام ہی اپنا احترام ہے۔ سب کی زندگی ہی اپنی زندگی ہے۔

## توبہ

اگر انسان کی اپنی عقل اس کی اپنی زندگی کو خوشگوار نہ بنا سکے تو اسے زعم آگئی  
سے توبہ کر لینی چاہیے۔

اگر اپنا گھر اپنے سکون کا باعث نہ ہو تو توبہ کا وقت ہے۔

اگر انسان کو اپنا حال، اور حالات درست کرنے کا شعور نہ ہو تو اسے دانشور  
کہنے سے توبہ کرنی چاہیے۔

اگر مستقبل کا خیال ماضی کی یاد سے پریشان ہو تو توبہ کر لینا ہی مناسب  
ہے۔ اگر انسان کو تلاش کے باوجود ہمیشہ غلط رہبری ارہنما ملیں تو اسے اچھے اطاعت  
شعری کے دعویٰ سے توبہ کر لینی چاہیے۔

اگر انسان اپنے آپ کو غم، پریشانی، غریبی، الوطنی، یا موت سے نہ بچا  
سکے تو اسے اپنے خود مختار ہونے کے بیان سے توبہ کر لینی چاہیے۔

اگر انسان ایک ہی پتھر سے دو دفعہ ٹھوکر کھائے تو اسے اپنی صحیح روی کی ضد  
سے توبہ کر لینی چاہیے۔

اگر انسان اپنی جوانی اور روپ سے پریشان ہو تو اسے بناؤ سنگھار سے توبہ  
کرنی چاہیے۔

اگر انسان میں اپنی کامیابی کا سرور ختم ہو جائے۔ اور اسے یاد آجائے کہ اس  
نے کامیاب ہونے کے لیے کتنے جھوٹ بولے تھے۔ تو اسے ضرور توبہ کر لینی

چاہیے۔

اگر انسان کو اپنے خطا کار یا گنہگار ہونے کا احساس ہو جائے تو اسے جان لینا چاہیے کہ تو بک وقت آگیا ہے۔ اپنے گناہوں کا احساس ہی توبہ کی ابتدا ہے۔ اگر گناہ کا کوئی گواہ نہ ہو تو توبہ تنہائی میں ہونی چاہیے، اگر گناہ پوری قوم کے سامنے سرزد ہوا ہو تو توبہ بھی پوری قوم کے سامنے ہونی چاہیے۔

دراصل تو بک خیال خوش بختی کی علامت ہے۔ جو اپنے گناہ کو گناہ نہ سمجھے وہ بد قسمت ہے۔ شیطان کو اپنی غلطی پر تو بک خیال نہ آیا ہمیشہ کے لیے لعین و رجم ہو گیا۔ انسان حکم حدودیوں پر توبہ کرتا رہتا ہے۔ اس لیے اشرف المخلوقات ہے۔ کافر اپنے کفر کو دین سمجھتا ہے اپنی عبرت کو پہنچے گا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے بے ضمیر اور اپنے مزاج کیخلاف عمل کرنا گناہ ہے۔ ایب ہرگز نہیں۔ گناہ اپنے مزاج کے خلاف عمل کرنے کا نام نہیں۔ اللہ کے حکم کے خلاف عمل کرنے کا نام ہے۔

گناہ اخلاقیات کے حوالے سے نہیں، دین کے حوالے سے ہے۔ اخلاقیات کا دین اور ہے اور دین کی اخلاقیات اور۔

سچ بولنا خلقی فریضہ بھی ہے اور دینی بھی، لیکن دین نے ایسی صدائیں بھی دیات کی ہیں جو اخلاقی صدائوں سے بہت مختلف اور ماورا ہیں۔ اللہ فرشتے، رسول، بعد، اور روح ایسی صدائیں ہیں، جنہیں اخلاقیات سمجھنے سے قاصر ہے۔ اخلاقیات انسانوں کہنائے ہوئے ضابطہ حیات کا نام ہے۔ اور دین اللہ کے عطا کئے ہوئے ضابطہ حیات کا نام ہے۔ گناہ اللہ کے فرمان سے انکار کا نام ہے۔

ایک پیغمبر اور اخلاقی مفکر میں فرق صرف یہی ہے کہ پیغمبر ایک اور دنیا کی صداقت بھی بیان کرتا ہے۔ جب کہ مفکر اسی دنیا اور اسی معاشرے کی اصلاح کی بات کرتا ہے۔ اخلاقیات دین کا حصہ ہے۔ لیکن دینیات اخلاقیات سے بہت بند ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ دینیات، اخلاقیات اور الہیات کے مجموعے کا نام ہے۔

بہر حال تو پہ اپنی پسند اور ناپسند کے حوالے سے نہیں، یہ اللہ کی پسند اور ناپسند کے حوالے سے ہے۔ ہم اس شے سے توبہ کرتے ہیں جو ہمارے عمل میں اللہ کی ناپسند کا باعث ہو۔ اس میں برائی بھی شامل ہو سکتی ہے۔ اور وہ عبادت بھی جسے ریا کاری کہا جاسکتا ہے۔ اور وہ منافقت بھی جسے فیشن کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہر وہ عمل جو اللہ کو ناپسند ہو گناہ ہے۔ اور ایسے ہر عمل سے توبہ کرنا ہی عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

اللہ اور انسان کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔ خالق اور مخلوق کے درجات کے علاوہ بھی فرق ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے کسی ملا کو دنیا کی خدائی دے دی جائے تو وہ اس دنیا میں کیا کیا تہدیلیاں کرے گا۔ کافروں کو نیست و نابود کر دے گا۔ یہودیوں کو فی النار کر دے گا، غیر اسلامی معاشروں کو تباہ کر دے گا۔ غرضیکہ اس دنیا کو اپنے جیسے مسلمان کر دے گا۔

یہ انسان کی خدائی ہوگی۔ اللہ کی خدائی وہ ہے، جو ہے، اللہ کے ہاں پسندیدہ دین اسلام ہی ہے۔ لیکن کافروں کو پیدا کرنا، انہیں طاقت اور قوت دیتے رہنا مسلمانوں کی جو حالت ہے اسے خاموشی سے دیکھتے رہنا، اللہ ہی کا کام ہے۔ انسان اور خدا کے عمل میں جو فرق ہے اس پر غور کرنا چاہیے۔ ہماری جو مرضی اللہ کے علاوہ ہے غلطی ہو سکتی ہے۔ اور اس غلطی سے توبہ کرنا لازم ہے۔ ہم اپنے بے ایک



زندگی چاہتے ہیں ایک انداز کی زندگی، اللہ ہمارے لیے ایک اور زندگی چاہتا ہے ایک اور انداز کی زندگی۔ اگر ان دونوں میں فرق ہے تو غلطی موجود ہے۔ اللہ کی پسند کے علاوہ کسی اور انداز کی زندگی کو پسند کرنا گناہ ہے۔ اور اس سے توبہ کرنا ضروری ہے۔

پنجمیہ خطا سے معصوم ہوتا ہے، کسی پیغمبر کا استغفار پڑھنا عجب ہے۔ نئے مقامات حاصل ہونے پر پرانے مقامات پر استغفار ہے۔ عروج کی منزل استغفار اور الحمد کی منزل ہے۔ نئی بلندی کا شکر اور پہلے درجے پر استغفار۔ مطلب یہ ہو کہ ایک مکمل نیک اور وحی الہی کے مطابق چلنے والی زندگی کے لیے بھی استغفار کا عمل منشاء الہی کے عین مطابق ہے۔ تو باللہ کی رضا کا حصول ہے۔

بار بار غلطی کرنے اور بار بار توبہ کرنے کے بارے میں اکثر پوچھا جاتا ہے۔ اگر انسان کو گناہ سے شرمندگی نہیں تو توبہ سے کیا شرمندگی۔ توبہ کا عمل ترک نہ ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ اگر انسان کو موت آجائے تو اسے حالت گناہ میں نہ آئے۔ بلکہ حالت توبہ میں آئے۔ اور کچھ خبر نہیں کہ موت کس وقت آجائے۔

گناہ کا احساس پیدا ہو جائے تو گناہ سے نفرت ضرور پیدا ہوگی۔ نفرت ہو جائے تو دوبارہ گناہ نہ کرنے کا عزم پیدا ہوگا۔ دوبارہ گناہ نہ کرنے کا عزم ہی توبہ ہے۔ اللہ کو گواہ بنا کر اپنی غلطی پر معذرت اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرنے کا وعدہ توبہ کہلاتا ہے۔

توبہ منظور ہو جائے تو وہ گناہ دوبارہ سرزد نہیں ہوتا۔ جب گناہ معاف ہو جائے تو گناہ کی یاد بھی باقی نہیں رہتی۔ اگر اللہ احسان فرمادے تو انسان کو

اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اس کی سابقہ برائیوں کو اچھائیوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اللہ توبہ کرنے والوں پر بڑا مہربان ہوتا ہے۔ آدم نے توبہ کی انہیں خلافت ارضی کا تاج پہنا دیا گیا۔ یونس نے توبہ کی انہیں نجات ملی۔ ہر توبہ قبول کرنے والے کو اللہ نے اپنا قرب عطا فرمایا۔ شرط صرف یہ ہے کہ توبہ صدق دل سے کی جائے۔ اور اپنے آپ کو اس راستے سے الگ کر دیا جائے۔ جس راستے پر غلطی کے دوبارہ ہونے کا امکان ہو۔

توبہ کرنے والے کی زندگی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اللہ سے توفیق مانگنی چاہیے کہ توبہ سلامت رہے۔ توبہ ممکن انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ وہ اپنی نظروں سے گر جاتا ہے۔ وہ احترام کے تصور سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ دعا سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ عبادت کی افادیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

گناہوں میں سب سے برا گناہ توبہ شکنی ہے۔ توبہ شکنی انسان کی شخصیت کو اندر سے توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ اس کا ظاہری وجود بے خراش ہو تب بھی اس کا اندر کا وجود قاش، قاش، ہو جاتا ہے۔

دراصل گناہ بالعموم انسان کو نقصان پہنچانے والا عمل ہوتا ہے۔ انسان نہیں سمجھتا کہ خالق نے جس عمل سے روکا ہے اس سے رک جانا ہی سعادت کا ذریعہ ہے۔

ادب کی دنیا میں اگر مصنف ایسی کتاب تحریر کرے جس سے قاری میں گناہ کی رغبت یا میلان پیدا ہو جائے تو ایسی تحریر گناہ ہی کہلائے گی۔ ایسے گناہ سے توبہ کرنا لازم ہے۔ مصنف کا عمل تصنیف ہے۔ اور یہ عمل خیر یا شر کے باب میں اپنا

انجام ضرور دیکھے گا۔ گناہوں پر اکسانے والے کا انجام گنہگار کے انجام سے بھی زیادہ خطرناک ہوگا۔ نیکی پر رگمزن کرنے کا عمل، نیک اعمال میں سب سے زیادہ مستحسن عمل ہے۔ ادیب مر جاتا ہے ادب زندہ رہتا ہے۔ اور ادب اپنی تاثیر پیدا کرتا رہتا ہے۔

تاثیر پیدا کرنے والا مرنے کے بعد بھی اپنے نامہ اعمال میں اپنے قاری کی نیکی بدی کے حوالے سے اضافہ کرتا ہے۔ جس نے جتنے زیادہ لوگوں کو نیک بنایا۔ اسے اتنا ہی زیادہ انعام ملے گا۔

مصنف کو اپنی گناہ ساز اور گناہ پرور تصانیف سے توبہ کرنی چاہیے۔ اگر توبہ قبول ہوگئی تو اسے نیک تصانیف کا شعور عطا ہوگا۔ جس سے وہ ہر آنے والے دور سے دعائیں حاصل کرے گا۔ آنے والے زمانوں کی دعائیں۔ یہ بد دعائیں جانے والے انسان کے لیے بڑی تاثیر رکھتی ہیں۔

نیت کا گناہ، نیت کی توبہ سے معاف ہوتا ہے۔ عمل کا گناہ عمل کی توبہ سے دور ہوتا ہے۔ تحریر کا گناہ تحریر کی توبہ سے ختم ہو جاتا ہے۔

جس ڈگری کا گناہ ہو اسی ڈگری کی توبہ ہونی چاہیے۔ صاحبِ تاثیر کی تحریر اس کے نامہ اعمال میں رکھی جائے گی۔ جس انسان کو جو دولت عطا ہوتی ہے اس کی باز پرس ہوگی۔ اغلاظ کی دولت حاصل کرنے والوں کو ضرور اس دولت کے استعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر نصیب یا وری کرے تو اپنی تحریر کو اپنی نیکیوں میں ضائع نہ کرے۔ یہ استعمال کر لیا جائے۔ گزشتہ پر توبہ کا مدعا ہی یہی ہے۔ کہ آئندہ اپنے اغلاظ کے استعمال کو اپنے اعمال کے آئینہ میں دیکھا جائے۔





## موتی

سمندر کی اقدہ گہرائیوں میں بسیط قلم کی تاریک پہنائیوں میں، سیپ کے باطن میں پردوں میں لپٹے ہوئے، مخفی خزانے، آب و تاب کے کرشمے فطرت کے شہکار، پٹی چمک دمک میں مست، درنا یا ب، موتیوں کی موجودگی ایک عجب سر بستہ راز ہے۔

موتی کیا ہیں۔ بس ایک جلوہ مستور کی داستان ہیں، انسانی آنکھ سے اوجھل، جھلمل کرنے والے، پردے ہی پردے میں پلنے والے کسی فنکار کی تخلیق کا افتخار ہیں۔ سمندر کا باطن اور پھر سیپ کا باطن اور اس میں چھپا ہوا خزانہ۔ گنج ہائے گراںمایہ کا یہ سرمایہ، انسانی عقل و خرد کے لیے تحیر کا مقام ہے۔

یہ کنز مخفی جب آشکار ہوتا ہے۔ تو آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے، یہ راز جب ظاہر ہوتا ہے تو اسکی قدردانیوں ہوتی ہیں۔ اس کی قیمتیں لگتی ہیں۔ اس کی ضرورتیں محسوس ہوتی ہیں۔ اور یہ چھوٹی سی مخلوق اشرف المخلوقات کی دنیا میں اپنے جہوؤں کی تابانیوں سے جگمگاٹیں پیدا کرتی ہیں۔ انسان موتیوں کی مالا سے اپنی ہستی دوبال کرتا ہے۔

فطرت کو موتی پسند ہیں اور یہ بڑے مقام کی تخلیق ہے۔ اللہ کریم نے بہشت میں رہنے والی حور کے حسن کو ایسے بیان فرمایا، کہ جیسے خمیے میں مستور موتی ہوں۔ درمکنون چھپے ہوئے موتی، سیپ کے باطن میں، پردے کے اندر موتی۔ ابدار اور تابدار موتی، انسانی آنکھ اور انسانی لمس سیدور، اپنی پاکیزگی کی چادر میں لپٹی ہوئی حور، اتنی پاکیزہ اور منزہ، جیسے یاقوت اور مرجان،

بیان حسن اور حسن کا بیان، اللہ، اللہ، یہ اللہ کا ہی کلام ہو سکتا ہے۔ اللہ کو موتی پسند ہیں۔ موتی سے تشبیہ، الہامی تشبیہ ہے۔ جس شے کو انسانی ہاتھ کے لمس کا تجربہ بھی نہ ہو۔ انسانی آنکھ انسان کی نظر سے بھی جس کا جمال آزاد ہو۔ وہ موتی کیا موتی ہوگا، جس طرح سمندر موتیوں کے سرمائے سے مالا مال ہے، اسی طرح بہشت دیکتے ہوئے لوگوں سے جگمگاتا ہے۔ غیموں میں چھپے ہوئے خزانے، انمول موتی، درہن، ایک راز سر بستہ، تخلیق کا شہکار، فنکار کا نقش، فنکار کا نقش افتخار۔۔۔ موتی ہی موتی، بہشت در بہشت، بچے موتی کی لڑیاں۔ خیام میں قیام کرنے والے انعام و اکرام کے جینے۔۔۔ انسان کوئی کوئی نعمت کا شکر ادا کرے، کس کس خزانے کا لفظ کرے، کس کس رحمت کو جھٹائے، رحمتیں ہی رحمتیں، نعمتیں ہی نعمتیں ہی برکتیں ہی برکتیں ہوتی فطرت کا پسندیدہ استعارہ ہے۔ یہ اشارہ ہے مومنوں کے بے منتظر رحمت کا!

یہ کائنات موتیوں سے بھری ہوئی ہے۔ سمندر کے اندر موتی، سمندر کے باہر موتی۔۔۔ بادلوں کی جھڑیاں، بچے موتیوں کی لڑیاں برستی ہیں۔ موتی برستے ہیں۔ آسمانوں سے موتیوں کی بارش ہوتی ہے۔ خزانے ہیں زمین کے بے، زمین کی پیاس بجھانے والے موتی۔ زمین کو دولت بخشے والے، زمین سے خزانے اگانے والے۔ زمین کو، ربو بیت بخشے والے، رب کے بنائے ہوئے، بادلوں کے برسائے ہوئے موتی، جھلمل کرنے والے قطرے، مقلطہ ہنزہ، پاکیزہ موتی، جل تھل کر دینے والے، کیا، کیا نعمتیں ہیں۔ کیا کیا برکتیں ہیں، موتی ہی موتی، خزانے ہی خزانے۔

سمندر میں موتی، زمین پر بارش کے موتی۔ اور پھر شبنم کے پاکیزہ گوہر۔ غنچے کو پھول کر دینے والے معصوم قطرے۔ کتنے خوبصورت ہیں، پر اسرار خزانے

ہیں۔ کتنے سر بستہ راز ہیں۔ کیا، کیا کرشمے دکھائی ہے اوس۔۔۔ شبنم۔۔۔ انسان  
کے پیسے، انسان کی صحت کے لیے۔ آسمانی انعام، موتیوں کا چہرہ کاؤ۔ شبنم بڑا راز  
ہے۔ رات کا اعجاز، رات کے آنسو، گل گل اٹھتے ہیں۔ دل کھل جاتے ہیں۔ گلوں  
کو رنگ اور رنگوں کو خوشبو عطا کرنے والی شبنم، ایک دولت ہے۔ موتیوں جیسی  
خوبصورت اور موتیوں جیسی قیمتی۔ فطرت کا عطیہ، مفت حاصل ہونے والا خزانہ، مخفی  
خزانہ، کس کس نعمت کو چھو، یا جائے۔۔۔ اللہ کی دین ہے۔

سمندر میں موتی، زمین پر موتی، ہوا اور فضا میں موتی، اور آسمان۔۔۔  
آسمان تو موتیوں سے جھللاتا ہے۔ چمکنے والے ننھے ستارے، دکنے والے موتی  
دور سے نظر آنے والے، راز ہائے سر بستہ، کائنات کی لامحدود وسعتوں میں  
جگمگاہٹیں۔ ستاروں کے دم سے ہیں۔۔۔ اللہ کریم نے ستاروں کو روشن شمعیں کہا  
ہے۔ استعارہ در استعارہ۔ ہم نے آسمانوں کو مصباح سے سجایا۔۔۔ سبحان اللہ، آسمان  
کی چادر کو موتیوں نے زینت بخشی۔ پاکیزہ موتی، ہر بستہ موتی۔ فطرت کے شہکار  
موتی۔ تخلیق کا نقار موتی۔۔۔ کیا کیا نقشے ہیں۔ کیا، کیا جوئے ہیں۔ کیا  
کیا رعنائیاں ہیں۔ ستارے ہیں کہ بس جھللاتے نظارے۔ موتی ہی موتی۔ موتیوں  
کی ٹریں، حسن و خوبی سے فطرت نے جڑاؤ کیا ہے۔ انسان غور کرے۔۔۔ سائنس  
اپنا کام کرے، محبت والے اپنا کام کریں۔۔۔ نگاہ کو جلوہ درکار ہے۔ اور جوئے  
سچے موتی ہیں۔ ہر طرف بکھرے ہوئے۔ خزانہ در خزانہ، حسن و حسن، عطف در  
عطف۔۔۔

موتیوں کے ذکر میں ان موتیوں کا تذکرہ کیسے نہ آئے، جو رات کے  
خاموش، ننگن میں درو والے دل کی سیپ کے باطن سے ظہور کرتے ہیں۔ اور انسان



پردہ نہیں رہنے دیتے۔ یہ وہ موتی ہیں جو انسان کو اس کے اپنے باطن سے آشنا کرتے ہیں۔ چشم کو ہر بار، عنایت پروردگار ہے،

دنیا کے عظیم انسان نالہ جنم شب کی داستان ہیں۔ رازہائے سر بستہ آشکار ہو ہی نہیں سکتے، جب تک آنکھ اشکیا رہے ہو۔۔۔

کہتے ہیں کہ ایک بہت پرانے زمانے میں ایک گرو نے اپنے چیلے کو جڑی بوٹی کارس اکٹ کرنے کا حکم دیا۔۔۔۔۔ چیلے نے عمر بھر جو اہر الحقائقیر، اکٹنا کیا۔ وہ خوشی خوشی خزانے سے بھری ہوئی شیشی لے کے چلا۔ اسے ٹھوکر سی لگی، اور اس کے ہاتھ سے شیشی گر کر چکنا چور ہو گئی۔۔۔۔۔ وہ تڑپا۔۔۔۔۔ پھر کا۔۔۔۔۔ اور لگا رو نے اور پکارنے کہے میرے گرو! میں برباد ہو گیا۔ میری کمائی لٹ گئی۔ میرا حاصل حاصل ہو گیا۔ اب تو میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب میں دوبارہ کیسے جتن کروں۔ میرے گرو، میں مر گیا، میں تباہ ہو گیا، میری دولت مٹی میں مل گئی۔۔۔۔۔ اس کا گرو سنتا رہا اور پھر اس نے خوشی سے قبضہ لگایا۔۔۔۔۔ چیلے نے کہا، گرو میں مر رہا ہوں۔ اور آپ ہنس رہے ہیں۔ گرو نے کہا تم سمجھ رہے ہو تم لٹ گئے، میں جانتا ہوں آج تمہیں وہ دولت مل گئی ہے جس سے بوٹیوں میں رس پیدا ہوتا ہے۔ خزانہ گم نہیں ہوا، خزانہ مل گیا ہے۔ چیلے نے پوچھا کون سا خزانہ؟ گرو نے کہا تیرے آنسو۔۔۔۔۔ یہ آنسو نہ ہوں تو دنیا میں ویرانی آجائے۔ میرے چیلے تجھے مبارک ہو۔ اب من کی چن سے آزاد ہو جا۔۔۔۔۔ اس دنیا میں دل کی بوٹی کا امرت، رس حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یعنی آنسو۔۔۔۔۔ آج تو سرفراز ہے۔ یہ تیرے من کے مندر کی مورتی کا درشن ہے۔

بہر حال انسان کے آنسو حصول رحمت کا قوی ذریعہ ہے۔ آنسو کی فریاد



مقبول ہے۔ نالہ، نیم شب ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے مقبول ہے۔ بارگاہِ صمدیت میں آنسوؤں کی درخواست رد نہیں ہوتی۔ آنسوؤں سے زمانے بدلتے ہیں۔ مقدر بدلتے ہیں۔ نوشتے بدلتے ہیں۔ حوادث کے طوفانوں کے رخ بدل جاتے ہیں۔ گردشِ ایام کے طور بدل جاتے ہیں۔ معصیت کو مغفرت مل جاتی ہے۔ بد حال ماضی کو خوش حال مستقبل مل جاتا ہے۔ گمشدہ برآمد ہو جاتا ہے۔

بھٹکے ہوئے راہی صاحبانِ منزل بن جاتے ہیں۔ گرداب میں گھرے ہوئے سفینے ساحلِ مراد تک آتے ہیں۔ فراقِ مجاز وصالِ حق بن جاتا ہے۔ اشکوں کے موتیوں کی مال، عالمِ بالا تک کی خبر لاتی ہے۔ یہ بچے موتی، گوہر ہائے تابندہ، انسان کو مایوس و مرمرے ہوئے انسان کو زندہ کر جاتے ہیں۔

جوفریاِ دلِ ظہار تک نہ آسکے۔ وہ اشکوں میں بیان ہوتی ہے۔ مذہب، رنگ، اور نسل سے آزاد، ہر انسان کی آنکھ میں ایک جیسے آنسو ہوتے ہیں۔ یہی انسان کا انسان سے واحد رشتہ ہے۔۔۔ ہمدردی کا۔۔۔ نمگساری کا۔۔۔

عشق کے مسافروں کا زادراہ آنسو ہیں۔ عشقِ حقیقی ہو یا مجازی، آنسوؤں سے عبارت ہے۔ روضہِ رسولؐ پر حاضری دینے والے آنسوؤں کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ سہرا یہ کسی کا احسان ہے، کسی کی دین ہے، کسی کا اعجاز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دریا کو پہاڑوں کے آنسو فرمایا ہے۔۔۔۔ بے شک آنکھ کو پتھر کہا۔۔۔۔ پتھر دل۔۔۔۔ پتھر نصیب۔۔۔۔

ہم اپنے اللہ کے سامنے کیا پیش کریں؟ نامہ اعمال تو پیش کرنے کے قابل نہ رہا۔ دفترِ عمل میں کیا دھرا ہے۔ رہی عبادت منظور ہو کہ نہ ہو کیا کہہ سکتے



## تقریب الہی (۱)

ہر مقرب جانتا ہے۔ کہ تقریب الہی کی منزل ایک لامحدود سفر کا نام ہے۔ اگر تقریب الہی کسی مقام کا نام ہے۔ تو یہ مقام بذات خود سفر میں ہے۔ خالق کے ساتھ مخلوق کا قرب کسی فارمولے کا محتاج نہیں۔ ویسے تو ہر مخلوق اپنے خالق سے متعلق رہتی ہے۔ لیکن مقرب کا درجہ اس کے اپنے فضل ہی کا نام ہے۔ آج تک کوئی انسان یہ نہیں بتا سکا کہ وہ کون سی صفات یا صفت ہے۔ جو انسان کو پیغمبر بنا دیتی ہے۔ ہر پیغمبر صاحب صفات ہے۔ معصوم عن الخطا ہے۔ لیکن اس کا پیغمبر ہونا کسی صفت یا صفات کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ صفت یا صفات کا ہونا اس کے پیغمبر ہونے کا نتیجہ ضرور ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ مقرب ہونے کے لیے صفات کا ہونا لازمی تو ہے۔ لیکن کافی نہیں۔

کسی پیغمبر کے ماننے والے میں اس پیغمبر کی صفات ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان صفات کے ہر وجود صاحب مرتبہ کبھی پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ مقرب کا تقریر ذات حق کے اپنے فیصلے کا نام ہے۔ اس سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ اللہ کریم کسی کافر یا باغی کو مقرب بناتا ہے۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ اللہ کسی کافر کو اگر مقرب بنانا چاہے تو پہلے اسے ایمان کی دولت عطا فرماتا ہے۔ یہی راز ہے کہ کسی کافر کے لیے تو دوزخ کا عذاب ہے۔ اللہ سے دوری ہے۔ اور کسی کافر کے لیے ایمان کا سرمایہ ہے۔ تقریب کی منازل ہیں۔ ایمان کا سرمایہ ہے۔ سابقوں کے درجے ہیں۔ اسی طرح جو مع شرہ اخلاقی طور پر انحطاط پذیر ہو، باغی ہو، اسے بالعموم تباہ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اسد سام سے قبل عرب کا مع شرہ ہر برائی رکھتا تھا۔ تباہ ہونے کے قابل تھا۔ لیکن اللہ نے اپنے فضل

بے پیرا سے اسے اپنی رحمت عطا کر دی۔ بلکہ رحمتہ للعالمین عطا فرمادیے۔ باغی معاشرے پر اللہ کی رحمتوں کی بارش، دور رہنے والوں کو تقرب کے مزدے، بد نصیبوں کو خوش نصیبی کی خلعت۔ اس کے کام وہی جاتا ہے۔ تقرب حاصل کرنے کا عمل کوئی عمل نہیں۔ یہ فضل کا مقام ہے۔ اس کی رضا کی بات ہے۔ اور اس کی رضا کی بس کیا بات ہے۔ جو چاہے کرے، جیسے کرے خالق مطلق ہے۔ وہ کسی کی آگے جواب دہ تو نہیں۔

وہ چاہے تو کسی کو ظلمات سے نکال کر نور میں داخل کر دے۔ چاہے تو اس کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے۔ اور کبھی کبھی شان بے نیازی کسی کے اعمال کو یکسر ضائع کر دے۔ اہلیس حکم عدولی کرے تو اسے ہمیشہ کے لیے عین و رجم قرار دے۔ آدمی حکم کے پابند نہ رہ سکیں۔ تو انہیں خلافت ارضی کے سفر پر روانہ فرما دیا جائے۔ تقرب کی منزل عجب منزل ہے۔ تقرب الہی کے جلوے ناہمروہ میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ مصر کے بازار میں بکنے والے غلام کو ایسا مقرب بنا دیا جاتا ہے۔ کہ اس کا قصہ احسن القصص بن کر رہ جاتا ہے۔ تقرب کی داستان کرباؤں کا سفر طے کر سکتی ہے۔ تقرب کا فارمولہ شہید کے خون سے لکھا جاتا ہے۔ یتیم کے ذقن سے تقرب کے نسخے مرتب ہو سکتے ہیں۔

ہر ماننے والے مومن کے دل میں تقرب الہی کی خواہش موجود رہتی ہے۔ انسان عبادت کرتا ہے۔ اس کے حکم کی اطاعت کرتا ہے۔ اس کے قرب کی آرزو کرتا ہے۔ لیکن ہر مومن یکساں طور پر مقرب نہیں ہوتا نہ ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کو اللہ خود ہی ولیاء اللہ کا ینام سے منصوب کرتا ہے۔ ان کے لیے خوف اور حزن کی سختی ختم کر دی جاتی ہیں۔ کچھ مومنوں پر گردش زمان و مکان کی منزل مسلط ہو جاتی ہے۔ وہ

مومن ہیں لیکن مصائب و آلام میں گھرے ہوئے۔ ان کے دل میں ایمان کا چراغ روشن رہتا ہے۔ لیکن حالات کے تیز طوفان ان پر حملہ آور رہتے ہیں۔ غریب کا یقین قائم رہے تو وہ مقرب ہو سکتا ہے۔ لیکن کبھی، کبھی غریب اپنی غریبی سے اتنا مغلوب ایل ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے بھی مایوس ہو جاتا ہے۔ غریبی انسان کو جہں مقرب کرتی ہے، وہاں اللہ سے دور بھی کر دیتی ہے۔

ایک مقرب کا حال دوسرے پر کم ہی عیاں ہوتا ہے۔ تقرب ایک رمزی طرح ہے جو محبت اور محبوب میں ہوتی ہے۔ ایک مقرب کا مرتبہ دوسرے مقرب سے بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے۔ کبھی، کبھی مقرب اپنے تقرب سے خود بھی نا آشنا ہو سکتا ہے۔

انسان جب تقرب الہی کی منزل پر روانہ ہوتا ہے۔ تو اس کے سب سے پہلے تقرب کی دلیل ہے۔ کہ وہ تقرب کی تلاش میں نکلا ہے۔ تقرب کا متلاشی اپنے آپ کا جائزہ لے۔ تو اسے معلوم ہوگا۔ کہ اس کے وجود کے کسی نہ کسی حصے میں تقرب کی تڑپ موجود ہے۔ وہ تڑپ ہی اس کے لیے تقرب کے راز فاش کرتی ہے۔ اگر انسان کی پیشانی میں تڑپ ہو تو اسے اللہ کا قرب سجدہ شوق میں میسر آئے گا۔ جبین شوق جب سجدوں سے سرفراز ہوتی ہے۔ انسان تقرب کی منزلیں طے کرتا ہے۔ ہر قلب کی جبین نیاز میں سجدوں کی تڑپ نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ اپنے، لک کا قرب اپنی مشتاق نگاہی سے تلاش کرتے ہیں۔ وہ کارہ چشم تمنائے کر نکلتے ہیں۔ اور نظروں میں اپنے، لک کی جلوہ گری سے لطف اندوز ہو کر تقرب کے مدارج طے کرتے ہیں۔ حسن حقیقی کی جلوہ گاہ میں محویت کے مقام سیان کا سفر الی اللہ شروع ہوتا ہے۔ دراصل سفر الی اللہ ہی سفر مع اللہ ہے۔ ایسے مقربوں کے سب سے محبوب کا چہرہ خانہ کعبہ سے کم نہیں۔ دیدار حسن یا ربی ان کے تقرب پروردگار کا درجہ رکھتا ہے۔



عشق محبوب اگر ان کی نماز کا امام نہ ہو تو وہ اپنی عبادت کو حجاب سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جو یہاں اندھا ہے۔ وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ محروم دیدار حقیقت کو اندھا کہا گیا ہے۔

جس متلاشی کی سماعت بے تاب ہو۔ اسے جلوہ حق کسی نغمے میں محسوس ہو گا۔ گوش مشتاق اس نغمے سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ جو ابھی ساز میں ہو۔۔۔۔۔ یہی وہ مقرب ہیں جو ہر نغمے کو آواز دوست سمجھتے ہیں۔ اور برحق سمجھتے ہیں

تقرب الہی کو اپنی عقل سے تلاش کرنے والا ایک لمبے سفر کا مسافر ہوتا ہے۔ وہ سول و جواب کی کشن راہوں سے مالک کا قرب حاصل کرتا ہے۔ وہ وجوہات اور نتائج کی کڑیاں ملاتا ہوا سبب اولیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ دریافت کر لیتا ہے۔ کہ یہ کائنات، وسیع و عریض، عبث نہیں بنائی گئی۔ اس کا بنانے والا ضرور ہے۔ اور وہی فطر حقیقی ان کی تلاش کا مدعا ہوتا ہے۔ صاحب عقل پر جب اسرار فاش ہوتے ہیں۔ تو وہ عالم تحریر میں پہنچ کر مقرب کا درجہ پالیتا ہے۔ اس کی عقل عقل سیم بن جاتی ہے۔ وہ آخری سوال کا آخری جواب دریافت کر لیتا ہے۔ یہی تقرب کی منزل ہے۔ کشن ہے لیکن ہے۔ تقرب الہی کے مختلف ذرائع اپنی، اپنی جگہ پر مستند و معتبر ہیں۔ لیکن تقرب الہی کا آسان ترین راستہ کسی ک۔ فیض نظر سے ملتا ہے۔ جلال الدین رومیؒ کو مولانا رومؒ بنانے والی نگاہ شریز کی نگاہ ہے۔ رہبر کامل اپنے مرید با صفا پر راز حقیقت آشکار کرتا ہے۔ پورا سے تقرب الہی کی منزلیں عطا کر دیتا ہے۔ اسی سے رہبر کامل کو کبھی کبھی صورت ظل لہ کہا جاتا ہے۔ اس کی طرف چلنے والوں کو جب وسیلہ ملتا ہے۔ وہ آسودہ منزل ہو جاتے ہیں۔ رہبر طالب کے دل میں محبت کے چراغ روشن کر کیا سے اطاعت اور عبادت کی اصلیت سے متعارف

کراتا ہے۔ یوں طالب تقرب الہی کی خلعت سے سرفراز ہوتا ہے۔

مقرنین حق کی شناخت کے لیے بھی کوئی فارمولہ نہیں۔ وہ لوگ عام طالبین سے مختلف ضرور ہوتے ہیں وہ عبادت تو خیر کرتے ہی ہیں۔ عبادت کے ساتھ محبت بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب آقا کے کسی فعل پر کوئی تنقید نہیں کرتے۔ انہیں مخلوق سے بھی کوئی گلہ نہیں ہوتا۔ وہ حاصل کی بجائے ایثار کو اپنا شعار بناتے ہیں۔

وہ محبوب کے ہر قسم کو کرم ہی سمجھتے ہیں۔ وہ جلوؤں کے متلاشی اور پیا سے ہوتے ہیں۔ وہ حیرت کی وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ انہیں ہر طرف حسن و جمال ہی نظر آتا ہے۔ مقرنین غصہ، حسد، کینہ، لالچ، اور نفرت سے آزاد ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے بے ضرر ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ سب کے لیے منفعت بخش ہوتے ہیں۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھاتے۔ کسی کا حق نہیں رکھتے، کسی کو اپنے سے کم تر نہیں سمجھتے۔ وہ گناہ سے نفرت ضرور کرتے ہیں۔ لیکن گناہ سے نہیں، کسی کی تباہی کی دعا نہیں مانتے۔ وہ دنیا کی محبت سے آزاد ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ شہرت، مرتبے اور دولت کے جلاہات سے نکل چکے ہوتے ہیں، وہ نیند پر بیداری کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا سرمایہ عشرت پروریز کی بجائے غم فرہاد ہے، وہ قطرے میں سمندر کی جھوہ گری دیکھتے ہیں۔ وہ ہر ابتلا میں بھی شاکر کرتے ہیں۔ وہ صابر ہیں، شاکر ہیں۔ وہ احسان و عدل کے مقامات سے آشنا کر دئے جاتے ہیں۔ وہ ہجوم میں بھی ہوں تو اکیسے ہیں۔ تنہا بھی ہوں تو ان کے پاس ہجوم خیال کے میلے ہوتے ہیں۔ مقرنین بس مقرنین ہیں۔ ان کی شناخت کا کوئی فارمولہ نہیں۔

اللہ کی رحمت سب کے لئے ہے، سب کے انتظار میں ہے، کوئی طالب دستک تو دے دروازہ ضرور کھلے گا۔



## تقرب الہی (۲)

عجب بات تو یہ ہے کہ اللہ کے مقرب، انسانوں کے قریب رہتے ہیں۔ کہیں انسانوں کا قرب ہی اللہ کا قرب نہ ہو۔ وہ جو صرف اللہ کے قریب تھا۔ اور انسان کے قریب ہونے سے منکر ہوا، اس کا حشر تو سب کو معلوم ہی ہے۔

اللہ کو پیار کرنے والے اللہ کے کام سے پیار کرتے ہیں، خالق کی عزت کرنے والے، خالق کا احترام کرنے والے، خالق کے عمل کا احترام کرتے ہیں۔ اور خالق کا عمل مخلوق کو پیدا فرمانا ہے۔ اللہ کریم نے انسان کو بڑے وثوق سے تخلیق فرمایا، انسان کو احسن تقویم کہا گیا۔ اللہ جب کسی کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرماتا ہے تو اسے مخلوق کی خدمت اور مخلوق سے محبت کا راستہ عنایت فرماتا ہے۔

اللہ نے اپنے سب سے پیارے انسان، اپنے محبوب انسان کو سب انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اور حضور اللہ سے محبت فرماتے ہیں۔ اور آپ مخلوق کے لئے باعث رحمت ہیں۔ اللہ کے تقرب کی راہ، مخلوق کی خدمت اور محبت کی راہ ہے۔ مخلوق کو ناپسند کرنے والا کبھی خالق کا مقرب نہیں ہو سکتا۔ مخلوق کو ڈرانے والا، مخلوق پر حکومت کرنے کی تمنائے، خالق کے باغی ہیں۔ مخلوق کے لئے رحمت مجسم، خالق کے لئے، خالق کی نگاہ میں خیر البشر ہیں۔ اللہ سے تقرب کا ثبوت مخلوق سے محبت میں پنہاں ہے۔ حضورؐ کی تمام زندگی مخلوق سے محبت کی زندگی ہے۔ آپؐ نے جانوروں سے، پرندوں سے، انسانوں سے، غرض کہ اللہ کریم کی پیدا کی ہوئی ہر ذی جان بے جان شے سے محبت فرمائی۔ آپؐ کا دل یا د الہی سے معمور ہے، اور آپؐ کا عمل خدمت خلق کا

دستور ہے۔ فنکار سے محبت دراصل اس کے فن سے محبت ہے، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والا اللہ کی مخلوق سے محبت نہ کرے۔ دراصل محبت کرنے والا ہی خدمت کرنے والا ہے۔

خالق نے اپنی ذات کو مخفی رکھا ہے، اور صفات کو آشکار فرمایا ہے۔ ذات سے محبت ہو تو صفات کا احترام لازم ہے۔ مقربین حق ہمیشہ انسانوں کی خدمت کرتے رہے، اور انھیں صداقت کی راہ دکھاتے رہے۔ اُن کی مشکلات کو آسان فرماتے رہے اور ان کے ظاہر و باطن کی خدمت کرتے رہے۔ خدمت مخلوق کی اور تقرب خالق کا، یہ رُزہر مقرب پر عیاں ہوا۔ عبادت بھی تقرب الہی کا ذریعہ ہے۔ اگ رعبادت ہی تقرب کا ذریعہ ہوتی تو انسان پر زندگی کے دیگر فرائض عائد نہ کیے جاتے۔

قرآن کریم میں اللہ نے تقرب کی جتنی راہیں دکھائی ہیں ان میں سجدے کے علاوہ سب راہیں مخلوق سے محبت کی راہیں ہیں،

اول د کے لئے ماں باپ کا ادب، اللہ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ یعنی ماں باپ کی خدمت کرنے والا اللہ کا مقرب ہوتا ہے۔ ہمیشہ سچ بولنے والا یعنی لوگوں سے صداقت کی بات کہنے والا مقرب ہے۔ انسانوں پر ظلم نہ کرنے والا اللہ کا دوست ہے، غصہ نہ کرنے والا، لوگوں کو معاف کر دینے والا، لوگوں پر احسان کرنے والا، اللہ کو محبوب ہے۔

زمین پر اتر کر نہ چلنے والا انسان اللہ کو پسند ہے۔ وہ انسان جس کا دل محبت سے سرشار ہے، اللہ کے قریب ہے۔ اللہ سے محبت ہی انسانوں سے محبت ہے۔ اللہ



خارجہ سے باہر نہ آتی، جو انسان اللہ کے جتنا قریب ہوگا، اتنا ہی مخلوق کے قریب ہوگا، اللہ کے قریب رہنے والے پیغمبروں کو مخلوق کے قریب ہی دیکھا گیا ہے۔ اللہ کا قرب یقیناً مخلوق کا قرب ہے۔ لیکن مخلوق کا قرب ضروری نہیں کہ اللہ کا قرب ہو، یہ راجح ضروری ہے۔

انسان اگر مخلوق کی خدمت مخلوق سے محبت، اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے کرتا ہے تو یہ عمل اللہ کے تقرب کا باعث نہیں۔ اگر مخلوق کی خدمت اللہ کی رضا کے لئے ہو تو یہ عمل باعث قرب حق ہے۔ نہیں تو نہیں۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ مذہب کے نام پر ایک دوسرے سے جد ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے نفرت پیدا ہو رہی ہے، وجہ یہ بیان ہوتی ہے کہ ہم یہ برداشت نہیں کرتے، کہ لوگ ہمارے عقیدے کے علاوہ عقیدہ رکھیں۔ وغیرہ، وغیرہ!

اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ہم جسے برداشت نہیں کرتے اسی کو تو اللہ نے پیدا فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات میں اپنے نہ ماننے والوں کو خود پیدا فرما کر بڑے راز عیاں فرمائے ہیں۔ اللہ اپنے نہ ماننے والوں کو صرف پیدا ہی نہیں فرماتا، انہیں رزق عطا فرماتا ہے، ان کی دنیاوی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے۔ انہیں پالتا ہے، ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اللہ چاہے تو انہیں پیدا ہی نہ فرمائے۔ انہیں ہمیشہ، ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دے۔ وہ خالق ہے۔ اس نے ہر طرح کی مخلوق پیدا فرمائی ہے۔ اللہ نے اعمال کے نتیجے کے لئے ایک دن مقرر فرما رکھا ہے۔ اللہ کے باغی ایک آنے والے دن کو اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھیں گے۔ دیکھیں گے اور غصوں کریں گے۔ غصوں کریں گے اور کہیں



منزل ہے۔ یقیناً بے گماں اور سُرور جاوداں کی منزل ہے، کائنات کو جہوہ حق سمجھنے کی منزل ہے۔ انسانوں سے پیار کی منزل ہے۔ خالق سے مخلوق اور مخلوق سے خالق شناسی کی منزل ہے۔ وحدت سے کثرت اور کثرت سے وحدت کے جوئے تلاش کرنے کی منزل ہے۔ یہ بے تاب دل اور متحیر دماغ کی منزل ہے، تقرب الہی کی منزل، عرفانِ مخلوق سے عرفانِ خالق تک کا سفر ہے۔ مخلوق کی خدمت خالق کی خدمت ہے۔ مخلوق سے محبت خالق سے محبت ہے۔ اور مخلوق کو ناپسند کرنا خالق کی محبت سے محروم ہونے کی دلیل ہے۔ جس نے خالق کا تقرب حاصل کر لیا، اس پر مخلوق کا راز منکشف ہو گیا۔ مخلوق کا راز تقرب حق کے اسرار میں سب سے بڑا راز ہے۔ جس پر یہ راز آشکار ہو گیا، اُس کے دل سے محبت الہی کے چشمے پھوٹ نکلتے۔ اُس کا مخلوق کے صیبرِ ابا رحمت بن جانا ہی اُس کے تقرب حق کی سب سے بڑی اور سب سے قوی دلیل ہے۔ سلام ہو اُس مقرب حق پر جس کا قلب ہی رحمتِ اعلیٰ ہے۔

## محبوب

عجب بات ہے کہ محبوب بیٹا جدا ہوا تو باپ کی بیٹائی چھن گئی۔ اور مدت بعد بیٹے کی قمیض کی خوشبو سے بیٹائی لوٹ آئی۔ کہیں محبوب، بیٹائی ہی نہ ہو اپنی چاہت کا چہرہ نہ رہے تو بیٹائی کیا بیٹائی ہے۔ شاید دیکھنے کی تمنا ہی بیٹائی ہے۔ شاید محبوب کا چہرہ ہی بیٹائی کا سبب ہے۔ اور یہی چہرہ بیٹائی کا سبب ہے۔

محبوب، محبت کی زندگی میں عجب رنگ دکھاتا ہے۔ محبت انسان کو ماسوائے محبوب سے اندھا کر دیتی ہے۔ وہ کسی اور شے کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا، اس کے دل و نگاہ میں صرف ایک ہی جلوہ رہتا ہے، محبوب کا جلوہ!

محبوب زندگی کے صحرا میں نخلستان کی نوید ہے، محبوب محبت کو زندگی کے میوے میں کیا کر دیتا ہے۔ محبوب ہی باعث سفر ہے۔ وہی ہم سفر ہے۔ وہی رہنمائے سفر ہے، اور پھر وہی محبوب ہی تو حاصل سفر ہے،

محبوب کبھی جلوہ بن کر رو برو ہوتا ہے۔ اور کبھی یاد بن کر چار سو ہوتا ہے۔ محبوب جدا ہو کر بھی جدا نہیں ہوتا۔ وہ ہر کے بھی نہیں مرنے۔ وہ محبت کی آنکھ میں رہتا ہے۔ آنکھ سے اوچھل ہو تو دل میں آ بیٹا ہے۔ محبوب ختم نہیں ہوتا۔ غائب نہیں ہوتا۔ وہ کبھی عدم نہیں ہوتا۔

دنیا کی رونقیں محبوب کے دم سے ہیں۔ انسان اپنی زندگی کو محبوب کی خوشنودی کے نئے وقف کرتا ہے۔ انسان تو انسان، کائنات کی سب مخلوق اپنے محبوب کے نئے سرگرمی ہے۔ مور کا رقص، برم آہو، نغمہ عن دل، چکوری

فریادہروں کا ططم، محبوب کی کرشمہ کاریاں ہیں۔ محبوب محبت کو شعور زیست عطا کر کے شعور ذات عطا کرتا ہے۔ بجدے سے انکار کرنے والا، حسن آدم سے بے خبر، ابلیس محبت سے محروم تھا۔ وہ رحمت سے مایوس ہوا مردود، ترار دے دیا گیا۔ ابلیس کا معبود تو تھا، محبوب کوئی نہ تھا۔ لعین ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ انسان کی محبت کے بغیر خدا کا سجدہ انا کا سجدہ ہے، خدا انسان سے محبت کرتا ہے۔ ابلیس اور اس کے پیچھے انسان سے محبت نہیں کرتے۔ کیسے کر سکتے ہیں؟

انسان سے محبت وہی کر سکتا ہے، جس پر خدا مہربان ہو، خدا جب کسی پر بہت مہربان ہو تو اسے اپنے بہت پیارے محبوب کی محبت عطا کرتا ہے۔ اللہ کے احسانات میں سب سے بڑا "حسان محبت" ہے۔ محبت کم ظرف اور کم نظر کا کام نہیں، یہ صافی ظرف اور بلند نگاہ انسان کا کھیل ہے، یہ بلند نصیب انسانوں کی بات ہے۔ اس زندگی میں جسے محبوب مل گیا، اسے سب کچھ مل گیا۔

محبوب کے ملنے کی دیر ہے کہ زندگی تڑ سے نکل کر انجم میں داخل ہو جاتی ہے۔ محبوب خود شعر نازک ہوتا ہے، اس کا قرب محبت کو شعر آشنا کر دیتا ہے۔ جسے محبوب نہ ملے ہو، جسے محبت نے قبول نہ کیا ہو۔ اسے غزل بے معنی نظر آتی ہے۔ اسے انجم سے پیرسا ہو جاتا ہے۔ محبوب مسمرنہ ہو تو رعنائی خیال کا منا محال ہے۔

محبوب اس ذات کو کہتے ہیں، جس کے تقرب کی تمنا کبھی ختم نہ ہو، اپنی ذات سے فنا ہو کر جس کی ذات میں بقاء ہونا منظور ہو، اسے محبوب کہاجاتا ہے۔ محبوب، محبت کے حسن انتخاب، اور حسن خیال ہی کا نام ہے،

ہر زندہ انسان کے لئے کوئی نہ کوئی محبوب ضرور ہوگا، جن کا کوئی محبوب



نہیں، وہ اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں، اپنی اداؤں پر مرتے ہیں۔ اپنے خون کی سُرخی پر فدا ہونے کی خواہش اُن کے خون کے سفید ہونے کی دلیل ہے، ایسے لوگ آئینہ خالوں میں اکٹروں کی طرح دیکھے جاتے ہیں۔ نہ وہ کسی کو پسند کرتے ہیں اور نہ ہی ان کو کوئی اور پسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے ان کی زندگی ایک جزیرے کی طرح ہے۔ وہ خود ہی آواز ہیں، اور خود ہی گوشِ برآواز۔ ایسے لوگ سخت دل اور تند خو ہوتے ہیں۔ ان کے نصیب میں تنہائیاں ہیں۔ ایسے لوگ کبھی، کبھی خودی سے آشنا بھی ہو جاتے ہیں، اُن کو اپنے ہی سز نہاں تک رسائی ہو جاتی ہے، اُن کا محبوب، اُن کی ذات، اُن کے نئے کرشمہ کاریاں کر جاتی ہے۔

آج کے دور کا انسان محبوب سے آزاد سا ہو گیا ہے، وہ انسانوں سے مایوس ہو چکا ہے، وہ اپنے آپ سے مایوس ہو چکا ہے۔ اُسے کسی پر کسی حالت میں اعتماد نہیں۔ وہ اپنے، ماضی پر نادم ہے ہی، سہی۔ اپنے مستقبل پر بھی نادم ہے۔

آج کے انسان کا محبوب سر ملایا ہے، وہ اپنے مال کو اپنا محبوب مانتا ہے، اسے چاہتا ہے، اس کی پوجا کرتا ہے۔ اُس کے وصال سے خوش ہوتا ہے۔ اور اس کے فراق سے ڈرتا ہے۔ آج کے انسان کو موت سے زیادہ غریبی کا ڈر ہے۔ مال کی محبت نے اسے اندھا کر دیا ہے۔ انسان کو غافل کر دیا ہے۔ اُس کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ جب بند ہونے لگے، بڑی محرومیاں ہیں، آج کے محبت کے نئے، آج کے محبوب کے حوالے سے۔

مال میں عجب حال ہے، پڑا رہے تو بے کار ہے۔ اس کی اقدیمت اس کے خرچ میں ہے، اس کے استعمال میں ہے، اس کی جدائی میں ہے، یہ محبوب ہمیشہ سے ہر ایک کے ساتھ بے وفا ہے، اور بے وفار ہے گا، بے جان مال کی محبت جاندار

انسان کو اخلاقی قدروں سے محروم کر دیتی ہے۔ مال کی محبت حریص بناتی ہے اور حریص کی جیب بھر بھی جائے تو بھی دل خالی رہتا ہے، کچھ لوگ خدا سے محبت کرتے ہیں، صرف خدا سے اور بس خدا کے بندوں سے نہیں، خدا کے بندوں سے محبت نہ کرنے والے کو خدا کیسے پسند کر سکتا ہے۔ خدا کے حبیب تو وہ ہیں، جو مخلوق کے محبت اور مخلوق کے محبوب ہیں۔ اللہ کی محبت کا راز انسان کی محبت میں ہے۔ اللہ معبود ہے، انسان محبوب۔ اللہ کی راہ انسانوں کی راہ ہے۔ انعام یافتہ انسانوں کی۔

آج کے محبوب مال نے انسان کو بڑی محرومیاں عطا کی ہیں۔ آدمی آدمی سے دور ہو رہا ہے، جغرافیائی فاصلے ختم رہے ہیں۔ لیکن دلوں اور نگاہوں کے فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ خاندان تو ختم ہو ہی چکا ہے، بیوی، اولاد، اور والدین کے درمیان پیسے کی دیوار حائل ہو چکی ہے۔ بیوی خاوند سے جدائی برداشت کر سکتی ہے، پیسے سے جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ مال کے مقدر میں پردیس لکھا جا چکا ہے۔ خاوند پردیس میں ہے، بیوی خطوط اور مال پر گزارہ کر رہی ہے۔ گھر سجائے جا رہے ہیں، اور جس کی خاطر مقصود تھی وہ نظر نہیں آتا، کمائیاں کرنے گیا ہوا ہے،

کچھ لوگوں کا محبوب نظریہ ہے، نظریات کی محبت نے ملکوں میں فساد مچا رکھا ہے۔ دائیں اور بائیں کی تقسیم قوم کو تقسیم کر چکی ہے، بھائی، بھائی کے رو برو ہے، بلکہ دو بدو ہے۔ گلستان وطن میں بڑے گل کھلنے والے ہیں، نظریہ پرست انسان، مردم پزار ہے، نظریات کی جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ صورت حال خونخوار ہے، انسان تقسیم ہو چکا ہے۔ ایران عراق نظریات ہیں۔ ہر دو فریق مصروف جہاد۔ سچے خدا کے نام پر دونوں گروہ جنگ کر رہے ہیں۔ کون سچا ہے، کون جھوٹا، دونوں سچے تو نہیں ہو سکتے۔ محبوب پرستی جنگ پرستی تو نہیں ہو سکتی، اپنے ہاں حکومت اور

حزب مخالف دو نظریے برسرِ پیکار ہیں۔ انسان کی محبت سے محروم لوگ نظریہ ست کی گرفت میں ہیں۔

انسان سے محبت نہ ہو تو وطن سے محبت بھی واہمہ ہے، جس دیں میں ہمارا کوئی محبوب نہ ہو، اس دیں سے محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ آج کے انسان کی وطن پرستی اس نئے مشکوک ہے کہ وہ انسانوں کی محبت سے عاری ہے۔ زمین، مکان اور پیسے سے محبت کرنے والا انسان محبت کی اصل روح سے محروم ہے۔ وطن اس نئے پیرا ہو تا ہے کہ ہمارے پیرے اس میں رہتے ہیں، ورنہ وطن کیا اور وطن کی محبت کیا۔ گر محبوب وطن سے باہر ہو تو محبت وطن سے باہر ہو جائے گی۔

محبولوں میں سب سے زیادہ خطرناک محبوب شہرت ہے، شہرت سے محبت کرنے والا دراصل اپنی انا کا پرستار ہے۔ انسانوں خدمت کے بغیر سر بندگی کی تمنّا ظلم ہے۔ جھوٹے معاشرے میں شہرت حاصل کرنے والا سچے معاشرے میں بدنام گنا جائے گا۔



تقرب میں ہیں۔۔۔ وصال میں ہیں۔۔۔ وہ عشق سے محروم ہیں۔۔۔ وہ صرف فرشتے ہیں۔ انسان۔۔۔ فراق میں ہے۔۔۔ عشق میں ہے۔۔۔ انسان کے پاس یاد ہے۔۔۔ اور یہی فرق ہے۔ دنیا اور آخرت کا۔۔۔ یہاں اللہ کی یاد ہے۔۔۔ اور وہاں دیدار ہوگا۔۔۔ انسان کو اشرف بنایا گیا ہے۔۔۔ اس کا شرف یہی ہے کہ اس کے پاس فراق۔۔۔ اس کے پاس عشق ہے۔۔۔ اس کے پاس یاد ہے۔۔۔ تمنائے وصال ہے۔۔۔

اور فرشتے۔۔۔ اطاعت میں ہیں۔۔۔ عشق میں نہیں۔۔۔ عشق سوز ہے، عشق ساز ہے، عشق خاموشی ہے، عشق آواز ہے۔۔۔ عشق میں حسن کا سب سے بڑا راز ہے یعنی فراق ہی تو وصال ہے۔

دنیا کے عظیم شاہکار فراق کے کرشمے ہیں۔۔۔۔۔ رومیو جیو لیٹ، ہیر رانچ، کسی ہنوں، ہونی مینوال۔۔۔۔۔ اور اس طرح کے کئی دنواز، دل سوز اور دلگداز واقعات دریائے فراق کی جواں موجیں ہیں۔۔۔۔۔

محبوب کا سب سے قیمتی تحفہ اپنے محبت کے لئے فراق کا تحفہ ہے۔۔۔۔۔ فراق کے زمانے شخصیت ساز زمانے ہوتے ہیں۔ انہی دنوں میں انسان بیدار ہوتا ہے۔۔۔۔۔ خوابیدہ اور خفتہ صلاحیتیں دریافت ہوتی ہیں۔ انسان کا اپنا باطن آشکار ہوتا ہے۔ محبوب کی یاد سے جگاتی ہے، اور جاگنے والا انسان فراق کی راتوں سے اور بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔۔۔۔۔ بھر کی رات، غم کی رات، عرفان ذات کی رات ہوتی ہے۔ انسان کے آنسو اُس کے لئے ایک عظیم مقدر لکھتے ہیں۔۔۔ کسی کی یاد میں جاگنے والے کبھی بد قسمت نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ کسی کے درد میں رونے والے دنیا کے ہزار ہا غم سے آزاد ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ محبت کا سجدہ، انسان کو ہزار سجدوں سے



نجات دیتا ہے۔ فراق والے نالہ رنیم شب سے آشنا کرائے جاتے ہیں۔ وہ  
 زمانے کا مقدر بھی سنوار سکتے ہیں۔۔۔۔۔ ایسے لوگوں میں مقدر ساز انسان بھی پیدا ہو  
 تے ہیں۔ فراق آگہی کا چراغ ہے۔۔۔۔۔ یہ جنوں کا روشن ستارہ ہے۔۔۔۔۔ فوری  
 میں آفتاب کے جہوں کی دریافت ہے۔ جزو میں گل کا ادراک ہے۔۔۔۔۔ قطرے  
 میں قلوب کی پہنائی کا عرفان ہے۔

وصل صرف ذات تک ہے۔۔۔۔۔ جب کہ فراق ساری کائنات تک۔۔۔۔۔  
 عالم شش جہت تک۔۔۔۔۔ انہام ممکنات و ناممکنات تک۔۔۔۔۔ رموز حیات و ممات  
 تک۔۔۔۔۔

فرق کو ہی ہد ہد فرخندہ فال کہا گیا ہے۔۔۔۔۔ اسے طوطی شکر مقل  
 کہتے۔۔۔۔۔ فراق ہی ظاہری اور باطنی بیماریوں کا اللاطون ہے، اور جالینوس  
 ہے۔۔۔۔۔ اس کے سامنے فاصلے، فاصلے نہیں۔۔۔۔۔ زمانے، زمانے نہیں۔۔۔۔۔ زمین  
 اور آسمان کی وسعتیں صاحبان عشق ہی طے کرتے ہیں۔۔۔۔۔ محبوب کا فراق مجز کو  
 حقیقت بنا دیتا ہے۔۔۔۔۔ ماسوا کو ماورائے کیا نسبت۔۔۔۔۔ کوئی صاحب عشق بتائے  
 تو بتائے۔۔۔۔۔ عشق صفات کو ذات کا حوالہ دیتا ہے۔۔۔۔۔ عشق جانتا ہے کہ جہوہ  
 'ذات کہاں ہے اور ذات کہاں۔۔۔۔۔ قطرہ دریائے اصل ہو کر اپنی ہستی کھودیتا  
 ہے، اور دریا کا در قطرے کو سوز جاوداں دے کر اسے کبھی شبیہ، کبھی موتی، کبھی ہنسو  
 بنا تا رہتا ہے۔

اس کائنات کی تمام روشنی صرف روشن ذات کی یاد ہے۔ مس کا عشق  
 ہے انسان کی ہستی کے تمام تقاضے فراق کی دریافت ہیں، موسیقی، شعر، فن تعمیر  
 و تصویر، تخلیق ادب فراق کی لہروں میں پلتے ہیں۔ تمام تخلیقی ادب اور ادبی تخلیقات

عشق کی دین ہیں۔ حسن خود اپنے طالب میں درد کے چراغ جلاتا ہے، اور پھر انہی چراغوں میں خون دل جلتا ہے، اور کوئی فراق زدہ انسان انہی چراغوں سے اپنے زمانے میں چراغاں کر جاتا ہے۔

سوچنے والی بات ہے کہ چاند سے کیا چیز نکلی، کہ دنیا میں چاندنی بن کر نکھر گئی، وہ کیا راز ہے، کہ دیار یار سے نکلنے والا بے قرار عاشق زمانے بھر کر قرار بن گیا.....

وصال جمود ہے اور فراق متحرک ہے..... وصال موت ہے فراق زندگی ہے..... زندگی کی نیرنگی اور رنگینی ہے.....

فرق محرومی نہیں..... یہ تو محبوب سے حاصل ہونے والی اچھائی قیمتی خزانہ ہے..... یہ امانت ہے جو صرف اسی کو دی جاتی ہے جو اہل ہو..... پہاڑ، زمین اور آسمان جس امانت سے لرز جاتیں..... انکار کر جاتیں..... وہ امانت، انسان کے دل کے لیے اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت ہے..... عشق..... یہ دولت، علم اور دانائی سے نہیں ملتی..... گمراہ کو پروانے کا دل نہیں مل سکتا یہ خدا کی دین ہے..... کہ وہی حسن ہے، اور عشق کی تمام کار فرمائی اسی کی عطا ہے۔

قصہ کوتاہ..... سب محبوب کے اپنے جلوے ہیں..... محبوب نظروں میں رہے، تو وصال کے موسم ہیں، بہاروں کے دن ہیں..... اگر محبوب دل میں آجے تو فراق کے موسم ہیں..... انوکھی بہاروں کے دن ہیں..... فراق کی بہار میں موتی بنتے ہیں..... پھول کھلتے ہیں، یعنی کئی قسم کے گل کھلتے ہیں، آسمان فکر سے تارے گرتے ہیں..... آنکھوں سے انگارے ٹپکتے ہیں، یہ دنیاوی فراق کی وادی

ہے ۔ یہ دس تو بس پر دس ہے..... تمناؤں کا جہان ہے... یادوں کے کعبے  
 میں عقیدت کے سجدے ہیں، اور پھر اس کے بعد..... جلوہ ذات کے بعد صرف  
 ذات ہی ذات ہے..... نہ جوں نہ چرا..... نہ آنکھ جھپکنے کا موقع، نہ دل دھڑکنے کی  
 اجازت... . محویت جمال، بارگاہ حسن میں سنانا..... نہ دشواری راہ کا گلہ..... نہ  
 دیرینہ جدائیوں کا شکوہ..... نہ ہونے کی خبر، نہ ہونے کا علم..... وصال صرف محویت  
 ہے۔۔۔۔۔ فراق مستی ہے۔۔۔۔۔ سرمستی ہے یاد کے عظیم صحر میں صرف  
 اشکوں کا دریا ہے، جس سے متلاشی سردی مے کے جام پیتے ہیں اور روز مرتے ہیں  
 ، روز جیتے ہیں۔۔۔۔۔ بات تعلق کی ہے۔۔۔۔۔ قریب اور دور کی نہیں۔

## دکھیا سب سنسار

بیوی نے خاوند کو الوداع کہا۔ جہاز اڑا۔ خیال نے رفعتوں کو چھوا۔ حوصلے بند ہوئے۔ یہ سفر آسودگی کی نوید تھا۔ خاوند کو نوکری مل گئی تھی۔ وطن سے دور دیا بغیر میں۔ تنخواہ ڈروں میں تھی۔ دن گزرتے ہی گئے۔ بیوی انتظار کرتی رہی۔ خاوند کا نہیں۔ اس کے بھیجے ہوئے پیسوں کا۔ پیسے ملے۔ بہت سے پیسے ملے۔ مکان سجا۔ فلوں لگے۔ روشنی ہوئی۔ مہمان آئے۔ کھانے پکے۔ رونقیں ہوئیں۔ بس صرف کھر کا لک ہی کھر میں نہ تھا۔ وہ بیچارہ پردہ سی، دیس میں ہونے والی رونقوں کو کیا جانے۔ کچھ دنوں کے بعد دونوں ہی دکھی تھے۔ تنہائی کا زہر ان کے وجود میں ر کر رہا تھا۔ چراغ جلتے ہی رہے اور دل بجھتے ہی رہے۔ اس دکھ کا کیا علاج۔ وطن میں رہو تو مال نہیں، مال ملے تو وطن نہیں۔ عجب صورت حال ہے۔ دکھوں سے بچنے کے لیے کوشش کرنے والے ایک نئے دکھ کے حوالے ہو جاتے ہیں۔

کیا زندگی میں دکھ کا ہونا لازمی ہے؟ کیا زندگی دکھ ہی کا نام ہے؟ اس کائنات میں؟ انسانوں کی کائنات میں کوئی بھی تو نہیں جس کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔ آج کا انسان بہت دکھی ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹ رہا ہے۔ اس کا ظاہر بے خراش بھی ہو تو بھی اس کا باطن قاش قاش ہوتا ہے۔

آرزوؤں کی کثرت نے انسان کو دکھی کر رکھا ہے۔ کثرت ہمیشہ دکھی ہوتی ہے۔ ایک خواہش پوری ہو، تو دوسری پوری نہیں ہوتی۔ خوش کا ایک لمحہ غم اور اندیشوں کے بحالت کو جنم دیتا۔ ایک حاصل میں کتنی ہی محرومیاں چھپی ہوئی ہوتی ہیں، انسان جو کچھ بھی ہوتا ہے، اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا، اور انسان فطرتاً

اپنے علاوہ کچھ اور ہونا چاہتا ہے۔ دنیا اسے ایک نام، ایک صفت سے پکارنے لگ جائے تو وہ خواہش کرتا ہے کہ لوگ اسے دوسرے نام، دوسری صفت کے حوالے سے پکاریں۔ ایسا نہیں ہو سکتا، پس وہ دکھی ہو جاتا ہے،

ہر انسان چاہتا ہے کہ اسے چاہا جائے اسے پسند کیا جائے۔ لیکن کیوں؟ اسی کیوں سے ہی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ لوگ اپنے علاوہ کسی کو پسند نہیں کر سکتے، اور خود پسندی کی عادت بھی خود گریزی کی علامت ہے۔ انسان خود کو بھی ہمیشہ کے لئے پسند نہیں کر سکتا، پس انسان دکھی رہتا ہے۔

انسان کثرت مال اور کثرت اولاد کو خوشی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ لیکن کثرت مال محض وہل ہے، اور کثرت اولاد اکثر انسان کے لئے دکھ کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے، اولاد کی آرزو، اور اولاد کی پرورش کی تمنا، اور پھر اولاد کی اپنی آرزوئیں، انسان کے لئے ایک عجب مصیبت ہیں۔ اولاد مندوب نہ ہو تو اک عذاب ہے۔

آج کل اولاد کا مندوب ہونا ایک مشکل مسئلہ ہے۔ آج کے بچے آج کے انسان کے دکھ کی علامت ہو سکتے ہیں۔

ایک آدمی کو دیکھا گیا کہ وہ کسی خانقاہ پر جا کر زور، زور سے دعا مانگ رہا تھا، کہ اے اللہ! تو نے میری وہ دعا جو سولہ سال پہلے منظور کی تھی، اسے اب نا منظور فرما دے۔ اے صاحب آستانہ بزرگ! تو بھی آمین کہہ۔ لوگوں نے کہا تو کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا میں منظور شدہ دعا کی نا منظوری چاہتا ہوں۔ لوگوں نے تفصیل پوچھی تو اس نے کہا، آج سے سولہ سال پہلے میں اسی آستانے پر حاضر ہو تھا۔ میں نے اللہ کے آگے دعا کی، کہ الٰہی! مجھے بیٹا عطا فرما۔ اللہ کی مہربانی اور اس



بزرگ کے وسیع سے مجھے بیٹا ملا۔ آج وہ جوان ہے، اور میں کیا بتاؤں کہ اس بیٹے نے مجھے کتنا تنگ کر رکھا ہے۔ مختصر یہ کہ میں دغا کرتا ہوں، کہ میری قدیم شدہ دن کوٹنا منظور فرمائے، میرے اللہ!

انسان کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ خوشی تلاش کرتا ہے۔ اور اسے کسی نہ کسی طرح غم سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی کے مقدر میں موت لکھی جا چکی ہے۔ اور اسی حقیقت کا انکشاف ہی انسان کے کرب کی ابتدا ہے۔ اُس کا حاصل لا حاصل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اُس کی قوت کمزور بن جاتی ہے، اُس کا توانا وجود لاغر و ناتواں ہو جاتا ہے، اُس کی بیٹائی کے چراغ مدہم ہو جاتے ہیں۔ اُس کی فکر مسدود ہو جاتی ہے۔ اسے محسوس ہونے لگتا ہے۔ کہ اس کے آگے دیوار ہے، اس کے پیچھے دیوار ہے۔ وہ جکڑ کے رکھ دیا گیا ہے۔ وہ بھاگنا چاہتا ہے لیکن راستہ اسے راستہ نہیں دیتا۔ وہ اپنے گھر میں کچھ عرصے کے بعد خود کو مہمانِ ساعسوس کرتا ہے۔ وہ اپنوں کے ہمراہ چلتا ہے، اور چلتے، چلتے اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بیگانوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ ساتھی چھوڑ جاتے ہیں، اور اجنبی ہمراہ ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ بھینٹ میں تنہا ہو جاتا ہے۔ اُسے کرب اور دکھ سے بچنا مشکل نظر آتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے نکل جانا چاہتا ہے۔ اپنے وجود میں رہنا اسے ناممکن نظر آتا ہے۔ اور وجود سے نکلنا بھی اتنا ہی ناممکن ہوتا ہے۔ نتیجہ دکھ کے سوا کیا ہے۔ وہ بے نام دکھ پر روتا ہے۔ اور رونے سے دکھ ختم نہیں ہوتا۔

ایک آدمی اپنے کسی عزیز کی موت پر رو رہا تھا۔ لوگوں نے کہا، صبر کرو، اب رونے سے کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے روتے، روتے جواب دیا۔ بھائیو رونا تو اسی

بات کا ہے، کہ اب رونے کا بھی کچھ فائدہ نہیں، میں اپنے رائیگاں آنسوؤں پر ہی تو رو رہا ہوں۔ کرب ہی کرب ہے۔ دکھ ہی دکھ ہے اور میں ہوں۔

ہم اس دنیا سے کچھ لے کر بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس دنیا سے کچھ لے کر جا نہیں سکتے۔ بس یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ سکتے ہیں۔ ہم سب قلی ہیں۔ سامان اٹھاتے پھرتے ہیں۔ خیال کا سامان، احساس کا سامان۔ مال، دولت، وجود، اشیاء اٹھائے، اٹھائے پھرتے ہیں۔ کب تک؟ قلی کا سامان کسی اور کا سامان ہوتا ہے۔ قلی کے نصیب میں صرف وزن ہے۔۔۔۔۔ وزن اور صرف وزن۔ اور یہ وزن کرب ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی کسی کی ملکیت نہیں۔ ہمارے دفتر ہمارے دفتر ہی نہیں ہیں۔ ہمارے ہاتھوں کے بھی ہیں۔ ہماری بادشاہت ہماری بادشاہت نہیں ہے۔ یہ ملک ہماری رعایا کا بھی ہے۔ کوئی کسی کا مالک نہیں۔

یہاں جو کچھ ہے۔ یہیں رہے گا، اور اسے اپنا کہنے وال یہاں نہ ہوگا، بڑے کرب ناک مرحلے ہیں۔ اس حیات چند روزہ میں۔ ہم صرف اپنی ملکیت کی ملکیت ہیں۔ ہمارے بچے ہمارے مالک ہیں۔ ہمارا مرتبہ ہمارا الہ جھ ہے، ہماری رصیہ ہماری طاقت ہے، بلکہ عبرت ہے۔ ہمارے ماتحت ہماری آزمائش ہیں۔ ہمارے سامنے ہمارے خلاف گواہیاں چل رہی ہیں۔ ہم بڑے روگ میں ہیں۔ ہمارا ہونا ہمارے نہ ہونے تک ہے، ہماری ہستی نیستی ہے، ہمارا وجود عدم ہے، ہمارا اول دلبروں کے توڑنے کے لئے بنا ہے۔ ہماری محبت ہماری قید ہے۔ ہماری نفرت ہمارا عذاب ہے۔ ہمارے اپنے ہمارے سنے ہیں۔ ہماری آرزو ہماری فریاد ہے۔ ہمارا اغرور ہمارا اپنا مذاق ہے، ہم حصار میں ہیں۔۔۔۔۔ آرزوں کا حصار، تمنوں کی زنجیر۔ ہمارا علم ہمارا حجاب ہے۔ ہمارا گھر خوبصورت لیکن زندان، ہم اسی میں رہنے پر مجبور

ہیں، ہمارے بس میں بے بسی کے علاوہ کچھ نہیں، ہم آزاد پیدا ہوئے لیکن پیدا ہونے کی مجبوری کے ساتھ، ہماری جوانی آزاد جوانی، بڑھاپے کی مجبوری ہے۔ ہم ریت کی دیوار ہیں، گرتے رہنا ہمارا مقدر ہے۔ ہمارے مقدر میں کرب ہے، دکھ ہے، اس کرب مسلسل سے نجات صرف اور صرف اپنی فنا کو تسلیم کرنا ہے۔ میری زندگی جس نے عطا کی وہی اسے واپس لے لیتا ہے۔ اس میں میرا کیا دخل ہے۔ کیا میں اپنے آپ میں اپنا دخل دینا چھوڑ سکتا ہوں؟، کرب سے نجات کی راہ یہی ہے۔ حکم دینے وال کا حکم زندگی ہے تو ہم زندہ ہیں۔ حکم دینے والا موت کا حکم دے تو ہم حاضر ہیں۔ غمغسوں کی بات نہیں، اطاعت کی بات ہے۔ اطاعت اور صرف اطاعت، دکھ سے نجات ہے۔ یہاں نہ کچھ کھانا ہے نہ پانا ہے۔ یہاں تو صرف آنا ہے، اور جانا ہے۔ دکھ کس بات کا۔

## خوف اور شوق

ڈرائیونگ کے احساس کا ایک قوی حصہ ہے۔ ہر حساس آدمی خوف زدہ رہتا ہے، خوف کی وجہ معصوم ہو یا نا معلوم، خوف قائم رہتا ہے، خوف انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ اس سے مفر مشکل ہے۔

جب تک زندہ رہنے کی خواہش زندہ ہے، زندگی کے ختم ہو جانے کا ڈر ختم نہیں ہو سکتا۔ ڈر ایک سائے کی طرح انسان کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے۔

نئی خواہشیں، نئے اندیشے پیدا کرتی ہیں، اور نئے اندیشے نئی خواہشیں  
تخلیق کرتے ہیں۔ خواہش کے نہ پورا ہونے کا ڈر ہر خواہش کے باطن میں موجود  
رہتا ہے۔ اور ڈر کے باوجود انسان خواہش کو نہیں چھوڑتا۔

بے یقینی کی فضا اور غیر یقینی حالات نے انسان کو اندیشے عطا کیے ہیں۔  
زندگی کا چراغ موت کی آندھیوں کی زد میں رہا ہے۔ موت سے زیادہ خوفناک شے  
موت کا ڈر ہے۔ یہ ڈر زندگی کو گھن کی طرح کھائے چلا جا رہا ہے۔ انسان جب یہ  
سوچتا ہے، کہ اس کی ہر چیز اس سے چھین جائے گی۔ اور وہ اعتراف و اقربا کو چھوڑ کر  
خدا ہاتھ کسی نامعلوم منزل کی طرف اکیلا روانہ کر دیا جائے گا۔ تو وہ خوف زدہ ہو جاتا  
ہے۔

موت کا عمل تو زندگی کے عمل کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے، بچپن، بچپن ہی میں مر جاتا ہے۔ جوانی ختم ہو جاتی ہے۔ پیرائی کے چراغ مدہم ہو جاتے ہیں۔





زده کرتا ہے، وہ خود خوف میں مبتلا رہتا ہے، جو طاقت خوف پیدا کرتی ہے، وہ خود خوف زدہ رہتی ہے۔ مگر تو کو کمزور ہو جانے کا خوف کھا جاتا ہے۔ طاقت کا استعمال خوف کے ساتھ نفرت بھی پیدا کرتا ہے۔ کمزور انسان کی نفرت ہی مگر تو کے لئے خوف ہے۔ یہ خوف طاقت کی موت ہے،

کوئی دنیاوی طاقت ہمیشہ کے لئے طاقتور نہیں رہ سکتی۔ فرعون کو موسیٰ کی پیدائش سے پہلے ہی خوف لاحق ہو گیا تھا فرعون کی دولت، اس کا دبدبہ، اس کی حکومت، اور اس کے لشکر اسے ایک بچے کے خوف سے نہ بچا سکے، ایک انسان کے خوف نے ایک بادشاہ کو چھین سے نہ بیٹھنے دیا، اور آخر کار طاقت غرق دریا ہو گئی، اقتدار اور اختیار کا بے قرار رہنا فطری بات ہے۔ کچھ لوگوں کے لئے ماضی کی یاد خوف پیدا کرتی ہے۔ کچھ لوگ مستقبل کے اندیشوں سے دو چار ہیں۔ خوف موجود لمحے کا تو ہوتا ہی نہیں، خوف صرف جانے والے یا آنے والے وقت کا ہوتا ہے۔ گزرے ہوئے زمانے کا خوف دراصل آنے والے زمانے کا خوف ہے۔ ماضی صرف اسی وقت خوف زدہ کرتا ہے، جب اس کا ناخوشگوار نتیجہ ابھی باقی ہو۔ اس کی رحمت پر نگاہ رکھی جائے تو خوف ختم ہو جاتا ہے، خوف آخر مفروضہ ہی تو ہے، وہ امید جو بھی رونما نہیں ہوا، اور رونما ہو سکتا ہے اندیشہ کہلاتا ہے۔ انسان اگر مستقبل کو آئینہ گھیل میں اتارنے کی بجائے حال کے فرض کا قرض ادا کرے تو خوف سے بچ جاتا ہے۔ مستقبل صرف خواب ہی تو ہے۔ خوف ناک ہو یا حسین حجتان تجبیر ہے۔ اور ماضی کتنا ہی بھی نیک ہو تصویر ہی تو ہے۔ بے جان تصویر، حال اور صرف حال حقیقت ہے۔ حال زندگی ہے عمل ہے۔ خوف سے آزاد، جو ہوا سو ہو چکا، جو ہونا ہے ہو جائے گا۔ صرف خوف کسی خطرے کو نال نہیں سکتا صرف خوف زدہ رہنے سے تو دشمن

نہیں مرتے، عمل کی ضرورت ہے، اور عمل کے لئے خوف سے نجات ضروری ہے۔ اس ذنی اور مختصر زندگی میں لوگوں نے خوف سے آزاد رہ کر کارنامے سرانجام دیے، عظیم تخلیقات ہوئیں، تہذیبیں پیدا ہوئیں، عجائبات بنائے گئے۔ تمدن پیدا ہوئے، اور پرانے کھنڈرات کے دامن میں نئی عمارتیں بنائی گئیں۔ زندگی صرف خوف زدہ رہنے کے لئے نہیں ملی۔ خوف ترقی سے محروم کر دیتا ہے، اور خوف زدہ انسان اپنے اندر ہی رحمت کی دیوار کی طرح گر جاتا ہے۔ اور یوں زندگی ہی میں مر جاتا ہے، عظیم انسان موت کی وادی سے باوقار ہو کر گزرتے ہیں۔

در اصل کچھ مزاج ہی ایسے ہوتے ہیں۔ جو ہر حال میں ڈرتے ہیں، عبادت کریں تو اُس کے نام منظور ہونے کا ڈر انہیں رہتا ہے، وہ سفر کریں تو حادثات کا خطرہ ان کے دل کی دھڑکنیں تیز رکھتا ہے۔ دھوپ ہو تو انہیں دھوپ سے ڈر لگتا ہے، بارش ہو تو بارش سے، وہ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج سے ڈرتے ہیں، وہ کسی ناگہانی آفت کی گرفت کے امکان سے آزاد نہیں ہو سکتے، اُن کے قلوب کی سر زمین میں ہمیشہ زلزلے آتے رہتے ہیں۔ وہ ہر دامنِ بے گلی سے ڈرتے ہیں، وہ ٹکڑے ہونے سے بھی ڈرتے ہیں، اور فاصلوں سے بھی خوف زدہ رہتے ہیں۔ اُن کے لئے ہر مشہدہ خوف پیدا کرتا ہے، اندیشوں کی آکاس بیل ان کی زندگی کے شجر کو لپیٹ میں لے لیتی ہے، اور اُن کی ہستی اُس ٹوٹے ہوئے جہاز کی طرح ہوتی ہے، جسے کوئی ہوا بھی راس نہیں آتی۔ یہ دل انسان کو کوئی حالت بھی خوف سے آزاد نہیں ہونے دیتی، کوئی نہ کوئی خطرہ اس کے وجود میں موجود رہتا ہے۔ اُسے دریا میں ڈوب جا نے کا ڈر رہتا ہے۔ صحرا میں پیاس سے مر جانے کا ڈر رہتا ہے۔ اُسے دنی کا ڈر رہتا ہے، اُسے عقیقی کا ڈر رہتا ہے۔ وہ شاید یہ نہیں جانتا کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب

سے وسیع تر ہے، یہ زندگی اندیشوں کے لئے پیدا نہیں کی گئی، یہ زندگی مس کی رحمت اور اس کے فضل کے حصول کے لئے دی گئی ہے۔ راتیں ہمیشہ تاریک نہیں ہوتیں، اور کوئی تاریک رات ایسی نہیں جو دن کے اجالے میں ختم نہ ہو۔ سورج ضرور طلوع ہوتا ہے، کامرانوں کا، سرفرازیوں کا، اعتماد اور یقین حاصل ہو جائے تو مدیشے ختم ہو جاتے ہیں۔ اعتماد محبت سے حاصل ہوتا ہے، خدمت سے حاصل ہوتا ہے، عبادت سے حاصل ہوتا ہے۔

جس زندگی میں شوق ہوگا، اس میں خوف نہیں ہوگا۔ خوف دوزخ ہے شوق جنت۔ مفادات کو مقدم سمجھنے والے مقام شوق نہیں سمجھ سکتے، شوق کا تعلق دل سے ہے۔ مفادات کا واسطہ دماغ سے، دل قربانیاں پیش کرتا ہے، عقل حاصل کی تلاش میں سرگرداں ہے، قربانیاں پیش کرنے والے کو کوئی ڈر نہیں ہوتا، اور حاصل کی تمنا کرنے والا محرومیوں کے اندیشوں سے نہیں نکل سکتا،

جب تک یہ زندگی اس مقصد کے لئے صرف نہ کی جائے جس مقصد کے لئے اسے تخلیق کیا گیا ہے، یہ خوف کے عذاب سے نہیں بچ سکتی۔ اور وہ مقصد خالق ہستی نے واضح اور واضح گفائے الفاظ میں فرما دیا ہے۔

پیدا کرنے والے کی غشا کے خلاف جو زندگی ہوگی وہ خوف زدہ ہوگی۔ خالق سے دوری جس شکل میں بھی ہو ڈر پیدا کرے گی۔ اور خالق کا اثر جس حالت میں بھی ہو، خوف سے نجات دے گا۔ فیصلہ انسان نے خود کرنا ہے۔

## بات سے بات

بہر حال یہ موسم خود ہی بدلتے ہیں، سفر کی تمنناج با آرام کی خوشی میں بدل جائے تو سمجھ بجھے کہ ایک نیا موسم آگیا ہے، سکون کا موسم، آرام کا موسم، یہ دوس کے دن، گھر کے اندر عبادت کے زمانے، نصیحتوں کا وقت، احتیاط کے ایام، صحت کا خیال، زندگی کی کارگزاری کا حساب، کردہ اور نا کردہ خطاؤں کی بازگشت۔

انسان حیرن رہ جاتا ہے کہ وہ اتنا کیوں بدل گیا ہے؟ دراصل عمر بدل جاتی ہے، خیال خود ہی بدل جاتا ہے، نہ جوانی ہمارا تصور ہے نہ بڑھاپا ہماری غلطی، یہ سب موسم زندگی کے اپنے موسم ہیں۔ ان موسموں سے گزرنای پڑتا ہے۔

پھر ایک موسم آتا ہے، آخری پت جھڑکا موسم۔ لاکھ کوشش کرو۔ ٹھہر نہیں سکتے۔ دیواریں قائم رہتی ہیں۔ اور مکان اندر سے زمین بوس ہو جاتا ہے۔ وجود کے اندر کچھ بھی تو موجود نہیں رہتا، کہاں گئے سب کرشمے، سب قوی، سب رنگ کیا ہوا؟ اس میں انسان کا کیا تصور۔ عظیم پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، ریت کا ڈھیرا

انسان احتیاط کرے تو بھی کچھ نہیں ہو سکتا، کیا انسان فصل کی طرح پیدا ہوتا ہے؟ موی، گاجر کی طرح۔ موسم سے آیا۔ اور موسم کی طرح زندہ رہا۔ اور موسم کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ کیا انسان کچھ بھی نہیں؟ کیا انسان اپنے ہونے میں بھی کچھ نہیں؟ کیا انسان ریکارڈ شدہ کیسٹ کی طرح ہے؟ بس چلتا رہا اور پھر ختم ہو گیا۔ کیا سب کچھ کاتب تقدیر کا ہے۔ اگر یہ سب کچھ اس کا ہے تو پھر انسان کا کیا ہے؟ انسان کو یہی بات تو مشکل معلوم ہوتی ہے۔ آزادی کیا ہے؟ آزادی کتنی ہے؟ مجبوری کیا ہے۔ مجبوری کس حد تک ہے؟

انسان کو عقل دی گئی۔ عقل کا استعمال بھی ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے، کہ کم عقل یا بے عقل انسان بھی عقل کا استعمال کرتا ہے۔ اس دنیا کی رونقیں عقل کے دم سے ہیں، عقل نے انسان کو ستاروں کی بلند یوں تک پہنچایا ہے، لیکن ستاروں کی گزر گاہوں کو ڈھونڈنے والا انسان یہ نہ معلوم کرسکا کہ زندگی کا راز کیا ہے؟

زندگی رونقوں میں گزرتی ہے، اور راز تہائیوں میں ملتے ہیں۔ رزق بتائے نہیں جاتے، راز آگہی یا راز آشنائی کا راستہ دکھایا جاتا ہے؟ اجتماع کا راز اور ہے، اور انسان کا راز اور؟ اجتماع ضرورت کے راز میں مبتلا رہتا ہے۔ ضرورتیں پوری کرنا، اجتماعی مسئلے کا حل سوچنا، شہر بنانا، شہری زندگی کی آسائشوں کا خیال رکھنا، صحت کے نئے شفا خانوں کا انتظام، تعلیم کیلئے سکول کالج بنانا، پانی کا حصول اور پانی کا نکاس ہڑکوں، روشنیوں اور فیتروں کا اہتمام، نیز اخبار، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ سب اجتماعی ضرورت کی باتیں ہیں۔ سفر وغیرہ کی سہولتیں ہر با معنی معاشرے کی ذمہ داری ہے۔

اجتماع اس بات سے بے خبر اور بے نیاز ہوتا ہے، کہ کسی شہر کی ساٹھ لاکھ کی آبادی، ساٹھ سال میں مکمل طور پر ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ اور اس کی جگہ نئے لوگ آتی بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد میں موجود ہوتے ہیں،

شہروں میں رہتے ہیں شہری بدل جاتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے نکلاں روم آج بھی طلبہ سے بھرے ہوتے ہیں، لیکن ہمارے ساتھ پڑھنے والے لوگ ایک، ایک کر کے رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی دنیا آباد رہتی ہے، اور لوگ ختم ہوتے رہتے ہیں، ہم زندہ رہیں تو بھی کچھ عرصہ کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں، کہ نا آشنا ہو



گلوں میں ہیں۔ آشنا بکھر جاتے ہیں، اور نا آشنا موجود پائے جاتے ہیں۔ مل ک رہنے والے لوگ الگ، الگ رخصت ہوتے ہیں۔ ہسپتال اپنی اہمیت اور اذیت کے سہارے قائم رہتے ہیں۔ اور ڈاکٹر مریضوں کی جان بچاتے، بچاتے خود ہی کسی دن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس سے مفر نہیں، جب جانا لازم ٹھہر تو ٹھہرنے کا ملنے کی لازم ہے؟ جب سامان لد ہی جانا ہے تو کتنا سامان درکار ہے؟ نسان علم حاصل کرتا ہے، دانائی کا علم، دانا لوگوں کی باتیں پڑھتا ہے، روحانی اور دنیوی زندگی کے سہ سالاروں، اور شد سواروں کی زندگی، اور ان کے عوم کی داستانیں۔ ن کے ہم عصر، اور ہم نواؤں کی گواہی کے قصے پڑھتا ہے تو انسان یہ بھول جاتا ہے، کہ دانائی کتاب سے حاصل نہیں ہوتی، دانا کی زندگی کا علم دانا نہیں، دنا کی زندگی کا عمل دانائی ہے۔ مثلاً ریت کے تپتے ہوئے صحرا میں عظیم نسان کا دیا ہوا خطبہ، دانائی کا شہکار خطبہ، آگ رہم کسی ایر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر پڑھیں تو ہمیں کتنا فیض ملے گا۔ عمل، عمل کے تابع نہ ہو تو علم علم کے مطابق نہیں رہتا، راز کی بات تو یہ ہے کہ راز جاننے والے کا عمل ہی راز آشنائی کا وسیعہ ہے۔

اگر موسم بدل جائے تو خیال بدل جاتا ہے، شاعروں نے گھنگور ٹھنڈاؤں کو تو بہ ممکن کہا ہے، سورج سر پر ہو تو سجدہ بھی روا نہیں، یہ عجب بات ہے کہ انسان کی عبادت اوقات کے ساتھ ہے، نماز قائم کرنے کا حکم ہے اور اس کے اوقات مقرر ہیں۔ ان اوقات کے باہر یا بعد نماز کی اجازت ہی نہیں، فجر کی نماز فجر ہی کو ادا کی جاتی ہے، ہمہ حال ایک ہی حال میں رہنے کا عمل اس لئے مشکل ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہ سکتی،

انسان ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ ایک سا ہی رہتا ہے، صحت خراب ہو تو

کوئی موسم بھی خوشگوار نہیں، اور صحت خوشگوار ہو تو کوئی موسم خراب نہیں ہوتا،

برے انسان کو ہر وقت برائی کا موقع مل جاتا ہے، اچھے کو اچھائی میسر آ جاتی ہے، ایمان والے ہر حالت میں ایمان پر قائم رہتے ہیں، کافر ہر لمحہ اپنے کفر پر کار بند رہتا ہے، وعدہ شکن کوئی بھی تو وعدہ پورا نہیں کرتا، بے وفاء کے بدلے میں ہی تو بے وفائیاں کرتا ہے، محبت والے محبت کرتے رہتے ہیں، اہل دل حضرات ڈرے، ڈرے میں دھڑکنیں محسوس کرتے ہیں، اور پھر دل انسان کو احساس کی دولت سے محروم ہونے کا بھی احساس نہیں ہوتا، کل کے دعویٰ آج کی معذرت بن جاتے ہیں، سیاست ہمیشہ میدان میں رہتی ہے، اور حکومت اہل ان میں، غریبوں کی حالت بدلنے کا دعویٰ کرنے والے خود غریبی کے ذائقے سے نا آشنا ہوتے ہیں،

انسان عجب مخلوق ہے، خود تماشا ہے، اور خود ہی تماشا ہی، انسان خود ہی میدان لگاتا ہے، اور خود ہی میدان دیکھنے بھٹتا ہے، ہجوم میں ہر انسان ہجوم کا حصہ ہے۔ اور ہر انسان اپنے علاوہ انسانوں کو ہجوم کہتا ہے۔ تنہائیاں اکٹھی ہو جائیں تو میدان بن جاتے ہیں۔ ننھے چراغ مل کر چراغاں بن جاتے ہیں۔

ایک زندگی کتنے ادوار سے گزرتی ہے، اس کا اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ بچپن کے کھیل، بچپن کے کھلونے، بچپن کے ساتھی چند دنوں کی بات ہے۔ دن گزر گئے کھیل ختم ہو گئے، بچہ بھول گیا کہ اس نے کون، کون سے کھیل کھیلے، کون، کون سی آرزوئیں اور تمنائیں تھیں، بچپن میں، بس وہ دن گئے اور وہ باتیں بھی گئیں،

جونی آئی اپنے ساتھ نئے تقاضے، نئے ساتھی، نئی تمنائیں، نئے قہقہے، نئے ہنس، نئے عزائم اور نئے حوصلے لائی، پہاڑوں کی سیر، دریاؤں کے

کنہ رے، باغوں کی بہار، سفر کے پروگرام۔۔۔ ہر وقت نئی بات نئے خیال، نئی کتا ہیں، مختص، تعلیم، حصول مراد، غرضیکہ ایک نیا سلسلہ ہے، جو جوانی کے نام پر انسان پر نازل ہوتا ہے۔ انسان چلتا ہے اور چلتا ہی رہتا ہے۔ بلند مقامات مشکل مراحل، مہم جوئی محنت جی، شعرو شاعری جوانی کے مشاغل ہیں۔ جوانی کھیتی ہے، جون آدمی جوں ہمت ہوتا ہے۔ جواں دل ملیں تو موسم بلکہ ہر موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ جوانی دلچسپیوں اور وابستگیوں کے چند طلسماتی ایام کا نام ہے۔ طلسماتی اس لئے کہ ن دلوں بڑے رموز آشکار ہوتے ہیں۔ انسان کو اپنے آپ میں کئی جہوئے نظر آتے ہیں۔ جوانی بد صورتی کو بھی دیدہ زیب بنا دیتی ہے، جوانی افکار کی بہار کا موسم ہے۔ جوانی فاصلے طے کرتی ہے، دلوں کے فاصلے، وقت کے فاصلے، زمانوں کے فاصلے، جوانی جاے سے باہر نکلتی ہے، حدود سے آزاد ہونا چاہتی ہے، جوانی کچھ نہ کچھ کرنا چاہتی ہے، کچھ نہ کچھ۔۔۔ خواہ وہ غلطی ہی کیوں نہ ہو، جوانی موج دریا ہے، کناروں سے ٹکراتی ہے اور کناروں سے باہر نکل جاتی ہے۔ جوانی اپنے کرشمے دکھاتی رہتی ہے، دن کو چہرے دکھاتی ہے اور رات کو تارے دکھاتی ہے۔ جوانی کے پاس ایک الوکھا کرشمہ ہوتا ہے۔ جوانی انسان کے خون کی گرمیاں لے کر چپکے سے رخصت ہو جاتی ہے، یہ جوانی کا آخری کرشمہ ہوتا ہے۔

انسان سوچتا رہ جاتا ہے کناروں کی محفل ماند کیوں پڑ گئی، وابستگیوں، بے اعتنائیوں میں کیوں بدل گئیں۔ اپنے اجنبی کیسے ہو گئے۔ اس میں انسان کا اپنا جرم یا خوبی کا کوئی دخل نہیں۔ یہ صرف موسم بدلنے کے نتیجے ہیں، عمر کا موسم بدل گیا ذائقے بدل گئے۔ پروگرام بدل گئے، ہر گرمیاں بدل گئیں، سب کچھ بدل گیا۔ موسم بدلنے کا وقت آجائے تو وقت کا موسم بدل جاتا ہے۔ ہر وصال فراق سے گزرتا

ہے۔ انسان اپنی مسرتوں کے زمانے کی یادیں آنسو سے تحریر کرتا ہے۔ تاج محل جوانی کے غم کی تحریر ہے۔ اور یہ تحریر اتنی دل پذیر ہے کہ اس کی جاؤ بیت سے انسان غم بھول جاتا ہے۔ جوانی کا غم شاعر کے دل سے گزرے تو یہ غم نوائے سروش بن جاتا ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ سقراط کا علم جاننے والا سقراط نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ سقراط کسی کتاب کو پڑھنے کے بعد سقراط نہیں بناتا تھا۔ سیرت پر کتابیں لکھنے وال ضروری نہیں کہ مسلمان ہی ہو۔ غیر مسلموں نے بھی نعت کہی، اور بہت اعلیٰ بھی،

آج کائنات راز آشناؤں کو پڑھتا ہے، راز نہیں جانتا، یہی وجہ ہے کہ آج کائنات محنت کے باوجود سکون سے محروم ہے، اس کا علم تقریباً لامحدود ہے، اور عمل تقریباً مفقود۔ لامحدود آرزوئیں زندگی کو عذاب بنا دیتی ہیں۔ آج کا عصری کرب یہی ہے۔ کہ انسان کثیر القاصد ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کا انسان مذہب سے آزادی چاہتا ہے، اس لئے کہ مذہب عمل کی دعوت دیتا ہے۔ اور عمل پر کاربند انسان انفارمیشن کے بیشتر علوم کو غیر ضروری سمجھنے لگتا ہے۔ آج کا انسان مقدر سے جھگڑتا ہے۔ وہ کسی تقدیر کو ماننا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ وہ خود بنانا ہے اپنی زندگی، اور زندگی محبت کی طرح بنتے، بنتے بگڑ جاتی ہے۔ انسان مقدر کو کوہستا ہے، مانتا بھی نہیں۔ اور چھوڑتا بھی نہیں، مقدر اور انسان ہمیشہ اکٹھے رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ جھگڑا کرتے ہیں۔ آزادی کی تمن مجبوریوں میں پرورش پا رہی ہے، یہی راز ہے کہ راز بیان نہیں ہو سکتا۔

دانائی اور حکمت کا میسر آنا، کسی کوشش یا علم یا عمل کا نتیجہ نہیں، کبھی شہد بناتی ہے، جگنو روشنی رکھتا ہے، اسی طرح دانای انسان دانائی رکھتا ہے۔ پرانے زمانے میں لہریوں تو نہیں تھیں۔ لیکن دانائی تھی، کتابیں تھیں، لیکن پیغمبر

تھے، آسائشیں نہیں تھیں، لیکن زندگی پرسکون تھی۔

دانا کیسے بنتا ہے۔ کامیابی کیسے آتی ہے، سکون کہاں سے ملتا ہے، خوشی کہاں سے نازل ہوتی ہے؟ راز کدھر سے دریافت ہوتا ہے؟ بس ایسے ہی جیسے انسان بنتا ہے۔ انسان کا پیدا ہونا ہی اس کے نصیب کے پیدا ہونے کے ساتھ ہے۔

کبھی، کبھی نیکی بھی ایسے آتی ہے جیسے بارش، کبھی، کبھی برائی ایک راستے کی طرح پاؤں کے نیچے آجاتی ہے۔ رات سے دن، اور دن سے رات، عزت، دولت، تعیناتی اور معزولی ہوتی ہی رہتی ہے۔

ہم جس پیشہ میں آج معزز ہیں، یہ بھی کسی اور رخ میں ناکامی کا نتیجہ ہے۔ ہم ایک شعبے میں سر دھڑکی بازی لگا دیتے ہیں۔ اور جب ہمیں معصوم ہوتا ہے کہ اور بھی شعبے ہیں، دریافت کرنے والے تو ہم الجھ جاتے ہیں، اور یہ الجھ وُخر دکی گتھیاں کہہ رہا ہے۔ وجدان اور جنون نہ ہوں تو خرد کی گتھیاں نہیں سلجھتیں، مقصد حیات، عمل حیات سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ راز، ہستی، رونق، ہستی کے علاوہ بھی ہو سکتا ہے۔ نصیب اور کوشش یکجا بھی ہو سکتے ہیں۔ اور الگ، الگ بھی، انسان اور مقدر کی صلح بھی ہو سکتی ہے، کارزار حیات، گلزار حیات میں بھی بدل سکتا ہے، اگر پیدا ہوئے اور مرنے کا اختیار انسان کو مل جائے تو زندگی بنانے کا اختیار اس کا اپنا ہے، اگر دنیا کی رونقوں میں میرے ہونے اور نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا تو مجھے رونقوں سے کیا حاصل؟

میری اول و نہ میرے منصب پر فائز ہو سکتی ہے، نہ میرے علم کی وارث، نہ



اس کا خیال مجھ جیسا، نہ اس کا عمل میرے عمل کے برابر، میری اول و مجھ سے اجنبی ہی رہتی ہے۔ پھر بھی اس اولاد کے لئے میں کیا، کیا جتن کرتا ہوں، کہاں، کہاں سے کیسے، کیسے گزرتا ہوں۔ کس کے لیے؟ بے حس کے لئے؟ میں نے جس کے لئے جو بھی کیا، اسے اس کا احساس نہیں۔ پھر میری زندگی کا مقصد وہ تو نہ ہوا، جو میں نے سمجھا، جو میں نے بنایا، میری محنت میرے کام نہ آئی۔ دوسروں کے کیا کام آئی ہو گی۔ پھر بھی میرا دعویٰ ہے کہ میں ہی صحیح ہوں، میرا پیشہ ہی صحیح ہے۔ میری کاروباری اور میرے کارنامے ہی عجائبات زمانہ میں سے ہیں۔ لیکن مجھے کون بتائے، کہ ایسا نہیں ہے۔ میں کسی کی سنتا نہیں، کسی کی مانتا نہیں۔۔۔۔۔ پھر وہ دن آ پہنچتا ہے، جب میرے اعمال اپنے نتیجے سے گزر کر میرے سامنے آتے ہیں۔ اپنا اصل چہرہ جب اپنے رویہ و آتما ہے تو سب دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم وہ نہیں تھے، جو ہم بنے ہوئے تھے، ہم بہروپ کے سروپ میں گم تھے، ہم تعریف سننے کیلئے جھوٹے مداحوں کو اکٹھا کرتے ہیں، اور جب راز آشکارا جاتا ہے تو ہم حیرت میں گم ہو جاتے ہیں۔ حیرت میں گم ہونا ہی رازک۔ سراغ کا نقش اول ہے۔ حیرت میں گم ہونا اپنے آپ میں گم ہونا ہے، جو اپنے آپ میں گم ہو گیا، اس نے اپنا آپ دریافت کر لیا، جس نے اپنا آپ دریافت کر لیا، اس نے راز دریافت کر لیا، راز خود دریافت کیا جاتا ہے، بتایا اور پوچھا نہیں جاتا۔ جس کو راز مل گیا، اس نے زندگی میں موت اور موت میں زندگی کو دیکھ لیا، قلزم قلزم آشنا نہ ہو تو ہزار کیسے پائے، اپنے ہونے کا مقصد اپنے نہ ہونے سے پہلے ہی دریافت کر لیا جائے۔ کم از کم اتنا تو جان لیا جائے کہ مجھ میں میرا عمل کس حد تک ہے؟ اور کسی اور طاقت کا عمل کس حد تک؟ وہ طاقت اگر مقدر یا نصیب ہی ہو تو کیا ہرج ہے۔ حسن تدبیر ہی اگر حسن تقدیر ہو جائے تو کیا بات ہے!

## ظلم

ظلم کا تعلق مظلوم کے احساس ہے، کسی ظالم کا کوئی عمل اس وقت تک ظلم نہیں کہہ دئے گا، جب تک مظلوم اس عمل سے پریشان نہ ہو۔ دنیا میں ہونے والے بیشتر مظالم مظلوم کی پسند کا حصہ بنا دیئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو مظلوم اس ظلم کو برداشت کرنا اپنے ایمان کا حصہ سمجھ لیتا ہے۔

ظلم کا سب سے بڑا ظلم یہی ہے کہ وہ مظلوم کو ظلم پہنے اور ظلم میں رہنے کی تعلیم دے چکا ہوتا ہے، امیر بادشاہ، غریب رعایا کو تسلیم، صبر اور رضا کی تعلیم دے کر اپنے مال کو محفوظ کرتا ہے، غریب کو صبر کی تلقین کرنے والے، خود امیر رہنا پسند کرتا ہے، ظلم ہوتا رہتا ہے اور کسی کو خبر تو کیا، احساس تک نہیں ہوتا۔ امیر حکمران اپنے بچوں کو نگرینوں کے سکول میں تعلیم دلواتے ہیں، اور غریب عوام کو دین کا حوالہ دے کر سمجھایا جاتا ہے، کہ ان کے بچے کسی دارالعلوم میں تعلیم حاصل کریں۔ درسِ نظامی سے ذریعہ تحصیل ہو کر غریبوں کے بچے کسی مسجد کے امام بن کر اُس کے حجرے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور امیروں کے بچے افسر بن کر حکومت کرتے ہیں۔ ظلم ہوتا رہتا ہے اور کسی کو محسوس نہیں ہوتا، اگر کوئی دانشور اس ظلم کی نشان دہی کرتا ہے تو اسے محض وزندیق کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ظلم پہنے والے، خود بھی ظلم کے ساتھ مل کر اس انسان کے خلاف ہو جاتا ہے۔ جو اس پر ہونے والے ظلم کی نشان دہی کرتا ہے۔ ظالم اپنے ظلم کو برقرار رکھنے کے لئے بڑے، بڑے روپ دھارتا ہے۔ کبھی مسیحائی کا روپ، کبھی رہنمائی کا بہروپ، کبھی آشنائی کا نذر، کبھی محبت کا ظلم، کبھی تعریف کرنے والے کی شکل میں۔۔۔۔۔ ظلم

بہر حال جاری رہتا ہے، آج مسیحائی کی وبا پھیل چکی ہے، ہر نا اہل کو زعم آگہی ہے، قوم پر انتشار نازل کرنے والے مسیحاؤں کی کمی نہیں، ڈاکٹروں کی کمی نہیں، ڈاکٹروں کی شکل میں ایسے مسیحا موجود ہیں۔ جن کی توجہ مریض کی بجائے ان کی جیب پر ہوتی ہے۔ مسکرا کر اتنی بات بتانے کے لئے کہ آپ کو کوئی بیماری نہیں۔ آپ سے فیس کا مطالبہ ہوتا ہے۔ آپ خوشی سے قلم سہجے ہوئے رخصت ہوتے ہیں، غریب کی بیماری، امیر ڈاکٹر کے لئے نوبہ بہار ہے۔ قلم جاری رہتا ہے اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی، سیاست کے میدان میں رہنما اپنے امان کے سفر میں بڑے، بڑے قلم کرتے ہیں۔ محو کو گمراہ کر کے ان کی زندگی عذاب بنا دی جاتی ہے، ایک ان پڑھ چھابڑی دے لے کو سیاست کے میدان کا شہسوار ہونے کی غلط فہمی عطا کر دی جاتی ہے۔ وہ بے چارہ قلم برداشت کرتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اسے بین الاقوامی سیاست کا مکمل شعور مل چکا ہے۔ وہ مریکہ مردہ باد کے نعرے لگاتا ہے، اور چھابڑی کو بساط سیاست سمجھتا ہے۔ اس بے چارے پر قلم ہو چکا ہوتا ہے۔ اور وہ اس سے آگاہ تک نہیں ہوتا، ایک نئے دور کی تمنا مجبور زندگی کو نئی اذیتوں سے دو چار کرتی ہے۔ راہنما کرسیوں کے کھیل میں غریبوں کی عافیت سے کھیلتے رہتے ہیں۔ قلم جاری رہتا ہے، اور مظلوم کو احسب س تک نہیں ہوتا۔

کچھ علمائے دین زندگی کی بے معنویت کو اس حد تک بیان کرتے ہیں، کہ محنت، کوشش، مجاہدہ اور سعی کی لگن چھن جاتی ہے، علم کا قلم سب سے زیادہ ہے، عذاب جو انسان کے کام نہ آئے۔ ظالم یہ عذاب مسلط کرتا ہے اور مظلوم اسے تعلیم کی ضرورت سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ تعلیم حاصل ہوتی ہے، اور ضرورت پوری نہیں ہوتی، تعلیم کا زیور گلے میں یوں لٹکتا ہے، جیسے پیل کے گلے میں گھنٹی، وہ گھنٹی کی

آواز سنتا ہے اور خوش ہوتا ہے، اور ظالم کی زمین میں اہل چلاتا ہے۔ وہ خود نہیں جانتا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ تعلیم ہے تو روزگار کیوں نہیں، روزگار تعلیم سے نہیں تعلقات سے نصیب ہوتا ہے۔ بے معنی تعلیم بد نصیب کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس ظلم کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ بہت خطرناک ظالم زندگی میں دوست بن کر آتا ہے۔ ایسے ظالم سے بچنا بہت مشکل ہے، جس کے پاس محبت کی تلوار ہو، وہ معصوم دوس کو محبت میں گرفتار کرتا ہے۔ اُن سے کام لیتا ہے، کام نکالتا ہے اور پھر ایک نامعصوم موڑ پر انہیں حوادثِ زمانہ کے حوالے کر کے شیطان کی طرح مسکراتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔ ایسے ظالم کے لئے بد دعا بھی نہیں کی جاسکتی، وہ اپنا تھا، اپنا بنا ہوا تھا۔ اس کے پرالے خطوط بھی محفوظ ہوتے ہیں، اور وہ ہر اخلاق کے قوانین کو بدائے طاق رکھتا ہوا، جھٹک کر چدا جاتا ہے۔ ہم جس کی تعریف کر چکے ہوں، اس کے ظلم کا بیان کس منہ سے کریں، بس ظلم ہو گیا، لیکن مظلوم ہمیشہ کے لئے خاموش رہ گیا۔

دراصل کسی شے سے خلافِ فطرت کام لینا ظلم ہے، جو شے جس کام کے لئے تخلیق کی گئی ہو۔ اس سے وہی کام لینا چاہیے۔ اس کے برعکس ظلم ہے۔ کسی انسان سے اس کے مزاج کے خلاف کام لینا ظلم ہے۔ جبر ہے، اس سے انسان کے اندر ایک جبر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اس پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ جمود اندر ہی اندر لوہے کی طرح کھولتا ہے، اور پھر کسی نامعلوم لمحے میں اہل کر ل وہ باہر آ جاتا ہے، اور ہر شے کو اپنی پیٹ میں لیتا ہوا تباہ کر دیتا ہے۔ مظلوم کی خاموشی، ظلم کی عبرت کی ابتدا ہے۔ خاموش مظلوم، خاموش طوفان کی طرح بڑا خطرناک ہوتا ہے، کسی انسان سے اس کے معاوضے سے زیادہ کام لینے کا نام بھی ظلم ہے۔ معاوضہ دینے والے کی ہستی کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ سب سے بڑا ظلم کسی کی محنت کو

رائیگاں کہتا ہے۔

کسی انسان میں وسوسہ پیدا کرنا بھی ظلم ہے، قوم کو تذبذب میں گرفتار کرنا بھی ظلم عظیم ہے۔ کسی راہی کو سفر کے دوران، اس کی مسافرت سے بیزار کرنا ظلم ہے۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد یہ سوچنا کہ ہمیں کس سفر پر روانہ ہونا ہے، ظلم ہے۔ کسی غریب کی عزت نفس کو غریب سمجھنا ظلم ہے۔ ظلم کی صورتیں بے شمار ہیں۔ مظلوم کی صورت ایک ہی ہے، غریب، سادہ، معصوم، شریف النفس، سادہ لوح، جدمان بینے والے، اپنا حق ترک کر دینے والا، سب کیلئے دے کرنے والا، اور اس کی دے کی وجہ ہی سے تو ظالم قائم رہتا ہے۔! نہ مظلوم کا مزاج بدلتا ہے، نہ ظالم کا۔ یوں ظلم جاری رہتا ہے۔ مظلوم ظلم کو مقدر سمجھتا ہے۔ اور ظالم اسے اپنی دانائی۔ دونوں اپنے، اپنے مدار میں قائم رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی تقدیر اپنے نام سے ہونے والے ظلم کو دور کرنے کے لئے مظلوم کی آنکھوں سے پردہ ہٹاتی ہے۔ اور پھر مظلوم اپنے غضب شدہ حقوق کے حصول کے لئے میدان عمل میں اترتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے، مظلوم، ظالم کی کرسی پر بیٹھتا ہے۔ اور ظالم کے لباس میں نظر آتا ہے۔ اور ایک بار پھر ظلم جاری ہو جاتا ہے۔ ظلم بہر حال ہوتا ہی رہتا ہے، اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

ظلم کا پہلے اس وقت تک جام نہیں ہوتا، جب تک معاف کرنا، اور معافی مانگنے کا حوصلہ اور شعور پیدا نہ ہو۔ بدلہ لینے کی تمنا، ظلم کی اساس ہے، معاف کر دینے کی آرزو، ظلم کا خاتمہ کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ظلم توڑنے والے پرانی باتوں کو چھوڑنے والے ہوتے ہیں۔ ظلم کے ساتھ ظالم کے ساتھ کیا سوک کرنا چاہیے؟ غمخوروں کی زندگی سے معلوم ہوتا ہے۔ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے



ساتھ جو سوک گیا۔ اس کا بدلہ یہی تھا، کہ جاؤ آج کے دن تمہارے سے کوئی سزا نہیں۔ فتح مکہ کے بعد آپ کے پرانے مخالفین کے لئے یہی ارشاد تھا۔ کہ جاؤ تم سب کے لئے آج کوئی سزا نہیں۔

اگر معاشرے میں معافی مانگنے اور معاف کرنے کا عمل شروع ہو جائے تو ظلم رک جاتا ہے۔ خود پسندی ترک ہو جائے تو ظلم رک جاتا ہے۔ انا کا سفر ختم ہو جائے تو ظلم کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو اللہ سے معافی کا خوشگوار ہے، اسے سب کو معاف کر دینا چاہیے۔ جس نے معاف کیا وہ معاف کر دیا جائے گا۔ دوسروں پر احسان کرنے سے ظلم کی یاد ختم ہو جاتی ہے۔ حق والے کا حق ادا کرو۔ بلکہ اسے حق سے بھی ماسوا دو۔ بس اتنے سے عمل سے ظلم ختم ہو جائے گا۔ جس معاشرے میں مظلوم اور محروم نہ ہوں، وہی معاشرہ نیک جی ہے۔

## کرب ہی کرب

مکان بنایا گیا..... خوبصورت، بہت ہی خوبصورت.... دیکھنے والے خوش ہو گئے۔ سوچنا پڑے گا، کہ اگر دیکھنے والے خوش ہوں تو کیا اس مکان میں رہنے والے لازمی طور پر خوش ہوں گے۔

خوش کرنے والا ضروری تو نہیں کہ خوش رہنے والا بھی ہو،.... پھر یہ سب کیا ہے؟ ہم کیا کر رہے ہیں؟..... اگر ہم خوش ہوں تو لوگ خوش نہیں رہنے دیتے، اگر لوگوں کو خوش رکھا جائے تو ہم..... رہتے ہی نہیں، خوش کہاں سے رہیں گے؟

کیا لوگ ہمارے مقدر کا غیر معاون حصہ تو نہیں۔ ہر آدمی اپنے علاوہ گروہ کو لوگ کہتا ہے۔ خود بھی اسی گروہ میں شامل ہے۔ لیکن وہ خود کو شامل نہیں سمجھتا، خود کو کردار سمجھتا ہے۔ اور دوسروں کو کردار کش..... ہم سب ایک سمت کو چل رہے ہیں۔ اور سب کا رخ لگ، الگ ہے۔ سب، سب سے نالاں ہیں..... سب سب سے اجنبی ہیں..... سب سب سے بے زار ہیں..... سب سب کے ہمراہ ہیں، اور سب سب سے جدا ہیں..... سب کے سب مشکل میں ہیں، اور سب کے سب بھاگ رہے ہیں۔ اور کوئی کسی کو رستہ نہیں دیتا۔ سب بظاہر متحرک انسان ایک ظالم جمود اور تعطل کا شکار ہیں، سب بھیڑ میں شامل ہیں۔ اور سارے اکیسے ہیں، ہم سب اکیسے ہیں۔ اور اس دنیا میں اکیسے لوگوں ہی کے میلے ہیں۔..... سب سوچ رہے ہیں، کہ آخر سوچ مضبوط کیوں ہے؟ کیا لوگوں کو نفرت سے محبت ہے، یا محبت سے نفرت ہے؟ لوگوں کو کیا ہو گیا؟ سب کو سب کی نظر لگ گئی ہے، اور سارے منظور نظر

بننے کے، رزومند ہیں۔ لیکن کس کے،..... ایسا کوئی نظر نہیں آتا، عجب حال ہے۔

ہمیں لاشعوری طور پر کسی شدید خطرے کا احساس ہے۔ ہم اسی نے بھاگ رہے ہیں۔ لیکن خطرہ کیا ہے؟ یہ معلوم نہیں خطرہ ہمارے پیچھے بھاگتا ہے۔  
 نہیں خطرہ تو ہمارے ساتھ، ساتھ بھاگ رہا ہے۔ . . . ہمارے ہمراہ ہے۔ . . . ہمارے سامنے ہے۔ . . . ہم اپنے لئے خود ہی خطرہ ہیں۔ . . . ہم خود ہی اپنے محبوب ہیں، اور خود ہی حاسد ہیں، ہم اپنے ہی سب سے بڑے دوست ہیں، اور خود ہی سب سے بڑے دشمن ہیں!

ہم بڑے کرب میں ہیں، کرب ہمارے دور کی سب سے قوی علامت ہے۔ ہم نے خود ہی ایک ملک بنایا، اور خود ہی سوچ رہے ہیں، کہ ہم نے اسے کیوں بٹایا!

ہم کہتے ہیں کہ ہم نے اسے اسلام کے لئے بنایا..... عجب بات ہے.....  
صحیح بات ہے، بنانے والے مسلمان تھے۔ کتنے بڑے مسلمان تھے جنہوں نے ملک  
بنایا، اور کتنے بڑے تھے، اس قافلے کا سالار..... بڑا اور سچا مسلمان..... لیکن کچھ اسد می  
گروہ مخالف تھے۔ کون مسلمان تھا؟ بنانے والا یا مخالف..... کتنا اسد می  
چاہیے؟ پاکستان کو قائم رکھنے کے لئے..... جتنا قائد اعظم کے پاس اسد می تھا، اس  
سے زیادہ یا اس کے علاوہ اسلام کی کیا ضرورت ہے؟ اگر ضرورت ہے تو قائد اعظم  
کی اسد می کے حوالے سے کیا اقامت ہے؟ اس کا اسلامی تشخص کیا ہے؟ ہمارے  
ذہن میں وہ تشخص مکمل ہے۔ اسلامی ہے۔ پاکستان بنانے کی حد تک تو اسد می آج  
سے نصف صدی پہلے ہی موجود تھا، اب مزید موجودگی کیا ہے؟ غور و تدبیر  
ہے، پاکستان کی خاطر جان دینے والوں کا ایمان مکمل نہ ہوا، تو ان کی موت شہادت

نہیں ہے۔ اگر شہادت ہے تو وہ ایمان کامل ہو سکتا ہے، جس اسلام نے وحدت عمل پیدا کی، وہی اسلام برحق تھا۔ وحدت فکر اقبال نے پیدا کی، اس کا اسلام برحق تھا، اب اور کیا چاہیے؟

جس بات سے قوم میں وحدت پیدا نہ ہو، وہ اسلام تو نہیں ہو سکتا، علماء صاحبان فیصلہ کریں، ورنہ کرب مسلسل رہے گا، لوگ اذیت میں مبتلا رہیں گے۔ جس اسلام نے ملک بنایا، اب اسی اسلام سے ہی اس کی بقا قائم ہو سکتی ہے! کچھ لوگ کہتے ہیں اور سچ ہی تو کہتے ہیں۔ کہ قیام پاکستان جمہوریت کیلئے تھا، مسلمانوں کی اکثریتی تھے ملک بنایا، بجا درست..... یہ اکثریت، ہندو اکثریت میں اقلیت تھی، یعنی اقلیت کے اکثریتی فیصلے سے ملک بنا..... عجیب بات ہے..... اقلیت کا اکثریتی فیصلہ بڑا طاقتور ہوتا ہے،..... خدا نہ کرے آئندہ بھی ایسا ہو..... ممکن ہے ایسا ہی ہو! بہر حال کرب کا عالم ہے۔ صاحبان فکر بڑے کرب میں ہیں، کہ جمہوریت کے داعی حکومت میں بھی ہیں، اور جمہوریت کے پرستار سرکوں پر بھی ہیں..... اصل جمہوریت کے طالب کون ہیں؟ جمہوریت ہی جمہوریت ہے۔ کرب ہی کرب ہے، اللہ خیر کرے، اندیشے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہمیں ہر طرف سے خطرہ ہے۔ آخر کیوں ہے؟ ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم ڈر رہے ہیں، ہم کیوں ڈر رہے ہیں؟ ہمیں نجات دلانے کے داعی خود تو نہیں ڈر رہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا..... ممکن ہے ایسا ہی ہو، خدا کرے ایسا نہ ہو، لیکن، لیکن..... کچھ نہیں.....

ہم نے کامیابی کا معیار ہی غلط بنا رکھا ہے، ہم طاقت، شہرت، دولت، مرتبے کو کامیابی کہتے ہیں۔ کامیابی یہ تو نہیں، کیا ہم نے آخرت پر ایمان چھوڑ

دیا؟ ممکن ہے ایسا ہی ہو، کامیابی مغرب کی تھلید میں نہیں... کامیابی تو اللہ کے حبیب کے تقرب میں ہے۔ ہم بھول گئے ہیں۔ شاید ہم خدا پر بھروسہ کرنے کی بجائے ووٹ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ووٹ گنتی کا نام ہے۔ وزن کرنے اور تولنے کا نام نہیں۔ جھوٹے لوگوں کے ووٹ سے سچا انسان کیسے آگے آ سکتا ہے۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ ووٹ کے بغیر سچا آدمی کیسے سامنے آ سکتا ہے۔ صدقتیں شہید ہوتی رہتی ہیں، اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔ صداقت کے سر فراز ہونے کا وقت کب آئے گا..... آئے گا ضرور آئے گا..... لیکن کب..... لیکن کچھ نہیں..... خاموشی سے کرب برداشت کرتے چلو..... بولنے سے بات الجھ جاتی ہے۔ بات کو الجھنا نہیں چاہیے، لہذا کرب بہتر ہے، اسے اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر لینا جائے،..... کیسے کریں..... کرب ناک بات ہے..... اللہ زمین اور آسمان کا مالک ہے، اس کی مسجد کے لئے چندہ چاہیے؟ کلمہ کفر ہے..... لیکن ہے۔ خدا ہمیں ہمارے شر سے محفوظ رکھے۔ خدا ہمارے دل میں پیدا ہونے والے شبہات کو غرق کرے..... کوئی ایسا سیلاب جو ہمارے اندیشوں کو بہالے جائے..... لیکن سیلاب..... خدا کرے سیلاب نہ آئے، سیلاب بری شے ہے۔ اندیشوں کے ساتھ ہی گزر کریں گے۔ آخر ہم عادی ہو چکے ہیں۔ ہم اندیشوں کی چادر بنائیں گیا اور پھر اس چادر کو تان کر سو جائیں گے۔ ہم خواب اور خیال کے پرستار ہیں۔ اے اللہ ہمیں اچھے، اچھے خواب دکھا۔ ہم حقیقت اور حقائق دیکھنے اور سوچنے کے کرب سے نجات چاہتے ہیں۔ یا اللہ ہمیں نجات



## رفعت خیال

رفعت خیال پستی حیات میں پیدا نہیں ہو سکتی، پاکیزگی، فکار کے سنے پاکیزگی، کردار کا ہونا لازمی ہے۔ حسن خیال کسی کوشش کا نام نہیں، کسی جستجو کا مقدم نہیں، محض تمنائے مخیل یا حصول مخیل کا ذریعہ نہیں۔ ارفع خیالات عنایت ہے عطا ہے، فضل ہے اور یہ عطا گنہگار اور خطا کار کے لئے قطعاً نہیں۔..... لطافت خیال کو اگر جبریل کہہ دیا جائے تو نزول افکار عالیہ یا نزول جبریل کسی کافر یا گمراہ کے سنے نہیں۔ جبریل، منے والوں اور مقدس نفوس کو دولت افکار کے خزانے مہیا کرتا ہے۔ ناپاک زندگی پاکیزہ خیال سے محروم رہتی ہے۔

رفعت خیال کو جاننے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ پستی حیات کیا ہے؟ وہ کون سا انداز حیات ہے؟ جس کے نصیب میں مخیل کی بندگی یا رفعت خیال نہیں ہے۔

لہجہ یا نوبھ انسان کی زندگی کو پست کر دیتا ہے۔ اشیاء کا حصول، مال کی تمنہ، مرتبوں کی حسرت، انسان کو اور انسان کے باطن کو صحرا کی ویرانیاں عطا کرتے ہیں۔ لہجہ زدہ دل ہمیشہ خوف زدہ رہے گا۔ خوف کبھی بلند پرواز نہیں ہو سکتا، لہجہ ظہر کی زندگی کی زندگی پر زور دیتا ہے۔ اور خیال باطن کا عروج ہے۔ لہجہ انسان کے نصیب میں باطن آشنائی نہیں ہوتی۔ اشیاء کا حصول، اشیاء کی محبت، اشیاء کی نمائش، اشیاء کا غرور و فخر کے دیس کی باتیں ہیں۔ اور بلند افکار یا بندگی ٹٹاہ بقا کی بستی کے نشانات ہیں۔ فنا، فنا ہے، بقا، بقا..... یعنی خیال کی بلند بقا کی دنیا ہے، اور بقا کا سفر اس وقت تک ناممکن ہے۔ جب تک فنا اور فنا کی محبت سے آزادی نہ حاصل کر

دی جائے۔ جب انسانوں کا گھر سامان سے بھرا ہوا ہو۔ دل تمنہ سے بھرا ہو، پیٹ خوراک سے بھرا ہو تو ایسی حالت میں ذہن کا خالی ہونا لازمی ہے پیسہ گننے وال خیال کی بند یوں کو کیا جانے بلند خیال انسان، اشیاء کے حصول اور اپنے حصول پر غرور سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر مکان یکینوں کی پہچان ہے تو یکین مر چکے ہیں۔ ن کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کا اپنا مکان ان کے اپنے آپ سے زیادہ اہم ہے۔ ان کا حال ان کی اپنی زندگی سے زیادہ ضروری ہے۔ بس یہی رکاوٹ ہے بند خیالی میں۔..... بلند خیال انسان اپنے مکان کی خود پہچان ہے، وہ جہاں بھی رہے گا، وہ جگہ اس کے دم سے پہچانی جائے گی، بلند خیال یکین اپنے مکان کی خود ہی زینت ہے۔ اسے کسی اور شے کی ضرورت نہیں، جس سے مکان ک وسجایا جائے۔ اس نے اپنے مکان کو اپنی ذات سے عزت بخشی، اور اپنے آپ کو بند خیالی سے معزز کیا۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے کسی اور دنیا میں رہتا ہے۔ پست خیال انسان اپنے وجود کو پالتا ہے، اور بلند خیال انسان اپنے وجود کو جالتا ہے۔ وہ خود سوز و وام کے سفر پر رہتا ہے۔

پست خیال انسان آکاس بیل کی طرح پھیلتا ہے۔ اور دوسروں کو پھیلنے سے روکتا ہے۔ وہ دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم کر کے اپنے نفس کی تسکین چاہتا ہے۔ بند خیال انسان شمع کی طرح جلتا ہے، اور روشنی دیتا ہے، جلتا ہے۔ روشن رہتا ہے، بند خیالیر روشنی ہے، وہ روشن رہتا ہے، روشن کرتا ہے، اور پھر اپنے اصل کی طرف یعنی نور کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس کی زندگی دوسروں کے لئے، اور دوسروں کا دکھ اپنے لئے۔ وہ بلند خیال ہے۔ پست خیال کو ہم خیال بنانا اس کا دین ہے۔ اس کا مذہب ہے، اس کا منصب ہے۔

ہر پست خیال خود غرض ہوتا ہے، اور ہر بلند خیال بے غرض ہوتا ہے۔ ہر حال حصول اور وصول کی تمنا انسان کو پستی میں جکڑ دیتی ہے۔ پست انسان سے گُر اللہ پوچھے، کہ تم کو بہشت میں بھیجوں، یا دوزخ میں تو فوراً کہہ اٹھے گا۔ جناب جہن دو پیسے کا ذکدہ ہو، میں بھیج دو! فائدہ پست انسان کا پسندیدہ شغل ہے۔

وہ ہر بات میں فائدہ تلاش کرتا ہے۔ ہر کام میں فائدہ، وہ فائدے حاصل کرتا رہتا ہے، اور زندگی ضائع۔ فوری فائدہ اس کو اصل فائدے سے متعارف ہی نہیں ہونے دیتا۔ اصل فائدہ، زندگی آسان ہو۔ سادہ ہو، پرسکون ہو۔ اندیشوں سے آزاد ہو، دشمنوں سے نجات ہو، زندگی بھی آسان ہو، موت بھی آسان ہو، یہ زندگی بھی آسان ہو اور وہ زندگی بھی آسان.....

پستی افکار، بعد کو فراموش کر دیتی ہے۔ انسان اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن مستقبل قریب، یعنی اپنے ہونے تک کا مستقبل..... حال نکہ اس کا مستقبل، اس کا قریب کا مستقبل، اس کا مابعد قریب کا مابعد، اس کی اول دہی ہے۔

اول دہی انسان کا مابعد ہے قریب کا مابعد۔ بلند خیال انسان اپنے اس بعد کو بھی توجہ دیتے ہیں، یہ درست ہے کہ بلند خیال یا بلندی خیول یا رفعت خیول، وراثت نہیں چھوڑتا، لیکن بلند فکری کا اصل نقطہ اصلاح فکر ہے۔ صاحب خیول اپنی اول و سے مقابلہ نہیں کرتا، حصول اشیاء کا مقابلہ، وہ اپنی اول و کو دعوت لٹا دیتا ہے، دعوت خیول دیتا ہے۔ اولاد کو اس کی فطری صلاحیتوں کے بیدار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر بیٹا باپ کی فکر باپ کے حخیل، اور باپ کے حسن خیول کا شہد نہ ہو، تو دونوں کا بعد خطرے میں ہے۔ لیکن ایک استخوان کے ساتھ، اگر باپ نوٹ ہو، تو باپ کے حسن خیول سے محروم بیٹا..... طوفان کی نذر ہوگا۔ باپ کی دن اسے

بچ نہیں سکتی! اگر بیٹا اور اہم ہو تو اپنے حسن خیال کے وثوق سے باپ کو دعوت دے، اور انکار کی صورت میں صنم خانہ آذری تباہ و برباد ہو جائے!

بہر حال حسن خیال دعوت خیال ہے، اور یہ دعوت محبت اور ہمدردی سے دی جاتی ہے۔ لوگوں کو آنے والے زمانے کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے دہرا کر سنائے جاتے ہیں۔ لوگوں کو ہوس پرستی اور ذات پرستی یعنی خود پرستی کے خوفناک نتائج سے آگاہ کرنا، بلند نظری کا مسلح نظر ہوتا ہے۔ غیروں کو محبت سے دعوت دی جاتی ہے۔ انہوں کو صرف اطہار ہی کافی ہے۔ اور اگر آپ قبول نہ کریں تو اپنے..... کیسے اپنے! جدا کر دیے جاتے ہیں ابہر حال بندی خیال کی بات ہو رہی ہے۔ بلند خیالی کی وضاحت کیا ہے؟ وہ کیا شے ہے جسے بند خیالی کہا جا سکتا ہے۔

کیا بند خیالی یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر آسمان کی باتیں سوچی جائیں۔ نہیں قطعاً نہیں۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس۔ بلند خیالی یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر یہ نہ بھولنا، کہ ہم زمین پر بیٹھے ہیں۔ اور زمین پر بیٹھنے والے، خواہ کتنا ہی اکڑ، اکڑ کر چلیں۔ آخر زمین کے اندر سما جاتے ہیں۔ مطلب یہ نہیں کہ ہم زمین پر چلنا چھوڑ دیں، اس لئے کہ اس کے اندر سما جانا ہے۔ نہیں قطعاً نہیں صاحبان خیال اپنے اعمال کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ اتنا بوجھ اٹھاتے ہیں جس سے سفر آسان رہے۔ ہر شے ہر وقت حاصل کرنے کی تمنا لا حاصل ہے۔ رفعت خیال انار میں پتی ہے۔ انار دراصل فروغ خیال کا واحد ذریعہ ہے۔..... مجبوری ہے۔۔۔

مجبوری یہ ہے کہ رفعت خیال، خوش خیالی یا خوش فہمی نہیں ہے۔ رفعت خیال اظہار میں ضرور آتی ہے۔ اور اس اظہار سے لوگوں کے لئے منفعت ہے۔ صاحب

خیال کے لئے خیال صرف سوز ہے۔ وجدان ہے، خیال، خیال نہیں ہے، جذبہ ہے۔ سورج کے پاس دنیا کے لئے روشنی ہے۔ اپنے لئے آگ... آگ  
الو... تپش... سوز... جلنا اور مسلسل جلنا... تو مجبوری یہ ہے کہ گر  
نہیں جلتا تو اسے رفعت خیال کیسے مل سکتی ہے۔ اُسے سورج کون بنائے گا جو روشنی  
دینے سے انکار کرے۔ مزاج میں مخلوت اور ایثار نہ ہو تو کبھی رفعت خیال نہیں مل  
سکتی۔..... رفعت خیال اپنے پاس رہے تو خیال نہیں رہتا، اپنا خیال دینے سے اپنا  
کھلاتا ہے۔

مجبوری یہ ہے کہ زندگی کے تمام اثاثوں میں، تمام خوبیوں میں، تمام حاصل  
میں سب سے قیمتی، سب سے اعلیٰ شے حسن خیال ہے۔ جو شخص کسی کو اپنا مال، جو  
خیال کے مقابلے میں کم تر اثاثہ ہے، نہیں دے سکتا، وہ کسی کو بند خیال کیسے دے  
گا۔ اور بندی خیال نہ دینے والا، بندی خیال نہیں رکھ سکتا، یعنی جس کے مزاج میں  
دنیا نہیں ہے، اس کے نصیب میں بند خیالی نہیں۔ تم مال تقسیم نہیں کرتے، خیال کیسے  
ہاں تو گئے۔..... یہی مجبوری ہے، اور اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے حاصل کو تقسیم  
کرو، اپنے حال میں شریک کرو، اپنے آپ کو دوسروں کے لئے سمجھو۔ یعنی جو تم نے  
دیا وہ تمہاری بندی ہے، جو تم لیتے ہو جمع کرتے ہو، جس کا اپنی ذات تک استعمال  
رکھتے ہو۔ جس پر مغرور ہو، جس حاصل سے لوگوں کو افسردہ کرتے ہو، جس مرتبے  
سے انہیں ڈراتے ہو، جس علم کے ذریعے لوگوں کو پریشان کرتے ہو۔ سب خود غرضی  
ہے سب پست خیالی ہے۔ کیونکہ بلند خیالی ایثار ہے۔ روشنی دینا اور آگ میں  
جن۔ بند خیال لوگ فطرت کے انوکھے شاہکار ہیں۔ ان کو الگ راز ہستی  
ملا، ان کو نئے معنی ملے۔ زندگی کے، ان کو حاصل اور محرومی کے نئے رخ سے آشنائی



ہوئی۔ بند خیال کامیابی اور ناکامی کے مفہوم حقیقی مفہوم سے آشنا ہوتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کسی مقصد میں کامیاب ہونا، زندگی کی کامیابی تو نہیں۔ گناہ میں کامیابی زندگی میں ناکامی ہے۔ ایک نئی غریب صاحب خیال ہو سکتا ہے۔ اور ایک بخیل امیر، ہمیشہ، ہمیشہ کے لئے محروم خیال.....

بہر حال رفعت خیال کی تمنا ہو تو مال اور مرتبے کی آرزو سے نجات ضروری ہے۔ مذت و جود سے گریز کرنے والے رفعت خیال سے آشنا کرائے جاتے ہیں۔

دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھنے والوں کو بلند خیال عطا کیا جاتا ہے۔ خدمتِ انسان کے مخلص جذبے کا طہرت خود خیال کے زیور سے آراستہ کرتی ہے۔ بند خیالی انسان کا وہ حاصل ہے، جو کوشش سے نہیں نصیب سے ملتا ہے۔ بند خیال انسان خاک نشیں ہو پھر بھی عرش نشیں ہے۔ رفعت خیال چونکہ عطا ہے۔ اس لیے صاحب خیال ہمیشہ عطا ہی کرتا ہے۔ اگر ممانی ہوتی تو ہمیشہ سنبھال کر رکھی جاتی۔ اگر سامان ہوتا تو سچایا جاتا۔ اگر مرتبہ ہوتا تو لوگوں کو ڈرایا جاتا۔ لیکن یہ تو عطا ہے..... دینے والے کا عمل۔ دینے والے نے دینے کیلئے دیا۔ پس دینے والے کو اور ایسا کرنے والے کو بند خیالی اس لئے ملی کہ وہ خود چراغ کی طرح جلیں، اور روشنی بانٹیں..... بخیل، مطلب پرست، طالب زر سوچتے جائیں، کہ یہ سب کیا ہے؟ بس خیال ہی تو ہے۔ رفعت خیال ہو تو کیا ہے؟..... رفعت خیال نعمت پروردگار ہے۔ زندگی میں حاصل ہونے والے، اور زندگی کے بعد بھی رہنے والا سرمایہ یہی رفعت خیال ہی تو ہے۔!

## بارِ تسلیم

ایک محد و دور مختصر زندگی میں انسان کس، کس کی لاج نبھائے۔ سب سے واجب الاحترام ہیں۔ سب لائق تعظیم ہیں۔ سب صاحب ارشاد ہیں۔ سب قابل تقلید ہیں۔ لیکن مجبوری تو یہ ہے کہ عرصہ حیات قلیل ہے۔ اس میں اتنی تسلیمات اور اتنی احاطتوں کا پورا ہونا ممکن نہیں۔ ہم پر کثرت قائدین کا خوف ناک تسلط ہے۔ کثیر المقصدیت کا شدید دباؤ ہے۔ ہم پر اعصاب شکنی کی وبا نازل ہو چکی ہے۔ مجبوریوں کے حصار میں جکڑے ہوئے انسان پر احاطتوں کی پیغار ہے۔ انسان جائے تو کہاں جائے۔

اللہ کے احکامات ہی لیجیے، اللہ کے احکام تو بس اللہ کے احکام ہیں۔ ارشادات باری تعالیٰ ایک زندگی کیلئے بس کافی ہیں۔ اوامر و نواہی کا سمندر، سمندر ہائے زب و روز سے زیادہ ہے، اور زندگی ہے کہ گردش روزگار کی چکی میں ہے۔

آج کے دور میں ایک انسان بے شمار طاقتوں کے سامنے جواب دہ ہے، وہ کرے تو کیا کرے۔ اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرے، اپنے باطن کی سیاہیوں کو دور کرے، اپنے پیٹ کی آگ کو بجھائے، اپنی پیشانی کو سجدوں سے سر فراز کرے۔ اپنی راتوں کو قیام و رکوع و سجود کی دولت سے مالا مال کرے، ... اگر کسی طریقے سے ایسا کر ہی لے تو اسے رموز مملکت سے آشنائی کیسے ہو؟ دو ویش سر براہ بالعموم مخلوق کو خالق کے حوالے کر کے اپنی عاقبت کو روشن کرتے رہتے ہیں۔ اللہ و لے کثر مخلوق سے ایسے بے نیاز ہو جاتے ہیں، جیسے خدا نہ کرے وہ مخلوق کے

خالق ہوں۔ بے نیازی خالق ہی کو زیب دیتی ہے۔ کیونکہ وہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں۔ سربراہ بے نیاز ہو جائیں تو انہیں غافل سربراہ کہا جاتا ہے۔ اور غافل سلطان رصیا پر ایک آزمائش کی گھڑی ہوتا ہے۔

مشکل تو یہ ہے کہ خدا کو راضی کرنا الگ بات ہے، اور مخلوق کو راضی کرنا اور شے ہے۔ دونوں کو بیک وقت راضی رکھنا بہت مشکل ہے۔ جب تک حالت یکساں نہ ہوں۔ تسلیم یکساں نہیں ہو سکتی، تسلیم یکساں نہ ہو تو سوک یکساں نہ ہو گا، اور سوک یکساں نہ ہو تو سب کا راضی ہونا، ناممکن ہے۔ نیک سربراہوں کا پریشان ہونا فطری بات ہے۔ اللہ کے احکام کی اطاعت میں پورا اترنے کیلئے پوری زندگی بھی کافی نہیں۔

اللہ کی اطاعت کے ساتھ، ساتھ اللہ کے حبیب کی اطاعت بھی لازمی ہے۔ آپؐ کا ہر عمل سنت ہے، اور اس کی پیروی لازم ہے۔ ہم آپؐ کے اقوال و احادیث کو یاد کر کے اطاعت کا فرض ادا کرتے ہیں۔ اور آپؐ کا عمل..... اگر ہم آپؐ کے اعمال کی اطاعت کریں تو کوئی انسان پیغمبر والے لباس سے زیادہ بہتر لباس زیب تن نہ کرے۔ آپؐ سلطان السلاطین ہیں۔ اور آپؐ کی زندگی معمولی انسان سے بھی زیادہ معمولی۔ اللہ اور اللہ کے فرشتے آپؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ اور

آپؐ فتنے سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ آپؐ نے تمام زندگی کسی انسان سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔

ہم آپؐ کی اطاعت کو جزو ایمان سمجھتے ہیں، اور ہم آپؐ کی اطاعت کا حق ادا نہیں کر سکتے، ہماری مختصر زندگی میں آپؐ کی میرت طیبہ کا علم حاصل کرنا بھی

آسان نہیں، آپ کی احادیث مبارکہ کا علم حاصل کرنا ہمارا ایمان ہے، لیکن ہمارے  
نے آسان نہیں، ہمیں اور بھی غم ہیں، ہم تسلیم کا بار کیسے اٹھائیں گے۔

اگر اللہ اور اللہ کے حبیب کی اطاعت کی بات ہوتی تو خیریت  
تھی۔ ہمارے لئے اور بھی فرائض تسلیم ہیں۔ قرآن کا علم قرآن نہیں قرآن  
دانی، جب کہ ہم عربی زبان سے اتنے آشنا بھی نہیں، مختصر زندگی میں قرآن کریم کا علم  
حاصل کرنا سب کے بس کی بات نہیں، اپنی زندگی کو منٹائے قرآن کے مطابق بسر کرنا  
فرض ہے۔ سعادت ہے۔ لیکن ایسی سعادت بزدل بازو نیست۔

ہماری زندگی..... اگر اسے ساٹھ سال ہی مان لیا جائے تو اس زندگی میں  
بیس سال سے زیادہ نیند کا عالم ہے۔ اس زندگی میں سے کچھ سال بک جاتے  
ہیں، ہم زندگی بچ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ زندگی کا پریش، بس پریش نگر ہی  
ہے۔ انسان بس پھٹا جا رہا ہے، ہم لوگ پوری محنت کرنے کے بعد بھی زندگی کی  
ضروریات پوری کر سکنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ضرورت کے پاؤں حاصل کی چادر  
سے باہر ہی رہتے ہیں۔

ہم لوگ ملازمتوں سے ریٹائر ہو کر ان ہی مصیبتوں میں مبتلا ہوتے  
ہیں۔ جن کے علاج کے لئے ملازمت کی تھی۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ ریٹائر منٹ کے  
بعد پھر کسی ملازمت کی تلاش ہوتی ہے، پھر کسی کرائے کے مکان کی تلاش ہوتی  
ہے۔ پھر ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ حالات کا حکم نافذ رہتا ہے، اور ہم اذیت  
میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کس، کس کا حکم مانا جائے۔ ضرورت کا حکم، بیاریوں کا  
حکم، سماج کا حکم، اور پھر مذہب کا حکم، اس پر مستزاد حکومت کے احکام۔

بات یہاں تک ختم ہو جاتی، تو گزر ممکن ہونے کی صورت رہ جاتی ہم پر اور بھی احاطہ عتیں واجب الادا ہیں، صحابہ کرامؓ کے ارشادات ہمارے لئے مینارہ نور ہیں۔ ہم جان پر کھیل کر بھی ان کی اطاعت کریں گے۔ آئمہ کرام کی اطاعت، فقہ کی اطاعت اور پھر اولیائے کرام کی، علمائے حق کے ارشادات ہمارے لئے جادہء حق کے روشن سنگ میل ہیں۔ ہم اطاعت پر مجبور ہیں۔ اور اس مجبوری پر مسرور ہیں، اتنی مجبوریوں میں اور بھی آوازیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اقبال کے ارشادات، کبھی اپنے من میں ڈوب جانے کا حکم، کبھی زمان و مکان توڑ کر نکل جانے کا حکم، اقبال کی اطاعت ہم فرزند اقبال سے زیادہ تو نہیں کر سکتے۔ الحمد للہ بچت کی راہ ابھی ہوتی ہے، ورنہ اقبال آشنائی کے فرض سے کوتاہی کے احساس سے شرمندگی میں ڈوب کر مر جانے کا مقام پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، ہمیں اقبال سے محبت ہے، ضرور ہے، لیکن اتنی محبت تو ممکن ہی نہیں، جتنی اولاد کو باپ سے ہو سکتی ہے۔ ہم عظیم انسان کے نام لیوا ہیں۔ اس کے وارث تو نہیں، تسلیم کا بوجھ اتنا اٹھائیں گے، جتنے ہمارے حصے میں آیا!

ہم پر قائد اعظم کے ارشادات کی تسلیم کا حق ادا کرنے کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ قائد اعظم کا ہر قول ہمارے لئے قولِ سدید ہے۔ قائد اعظم کا ہر قول ہمارے لئے ایک عملی نمونہ ہے۔ جتنا اسلامی عمل قائد اعظم اور اقبال کے پاس تھا۔ بس اتنا ہی اسلامی عمل ہمیں منظور ہے۔ لیکن ہمارے علمائے عمل سے راضی نہیں ہوتے۔

سوال یہاں سے شروع ہوتا ہے، کیا ایک زندگی میں ہم کس، کس کی زندگی کو نمونہ بنائیں، اور ایک دماغ سے کس، کس کی بات کو فیصلہ مانیں۔ اور ایک دل سے کس، کس سے محبت کریں، ہمارے لئے تسلیم کا بار بار گراں ہے۔





## معمولی بات

معمول بات بڑے غیر معمولی نتائج برآمد کرتی ہے، کبھی، کبھی ایک چھوٹی سی بات اتنی بڑی بات ہوتی ہے، کہ اسے دانتی اور رعنائی خیال کی انتہا سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگر چھوٹی بات کو چھوٹا نہ سمجھا جائے تو کوئی بڑی بات بڑی نہ رہ جائے

چھوٹے کاموں کو بڑی احتیاط سے کرنے والا انسان کسی بڑے کام سے کبھی مرعوب نہیں ہوتا۔ چھوٹے انسانوں سے محبت کرنے والے، انسان کا ادب کرنے والے، انسان سے برابر کا سلوک کرنے والا، کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ سے نہیں ڈرتا، معمولی انسان سے محبت غیر معمولی انسان کا ڈر نکال دیتی ہے۔ ایک سجدہ حاصل ہو جائے تو ہزار سجدوں سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

دنیا کے عظیم اور غیر معمولی واقعات کی بنیاد میں اکثر اوقات معمولی اتفاقات نظر آئیں گے۔ ایک انسان نے دوسرے کو دیکھا معمولی سی بات تھی، ایسے اکثر ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس دفعہ ایک انسان کو دوسرے کے چہرے میں کچھ اور ہی نظر آیا، معمولی سی بات ہے۔ نظر کا ملنا اور پھر دل کا دھڑکنا، اور پھر کائنات کا رنگ و نور میں ڈھل جانا۔ غرض یہ کہ بے شمار غیر معمولی واقعات پیدا ہو جاتے ہیں۔ فوجیں بڑ جاتی ہیں۔ تخت چھن جاتے ہیں۔ ملک آباد یا برباد ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں کتنی ہی آنکھوں کو خون کے آنسو دے جاتی ہیں۔ کلو پیٹرا کی ناک قدیم مصری اور یونانی تہذیب میں بڑے غیر معمولی نتائج برآمد کرتی رہی ہے۔

معمول سے پرندے ہمدرد کی اطلاع سے ایک غیر معمولی عظیم پیغمبر حضرت سیمان کے دربار میں کتنے ہی غیر معمولی واقعات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ارادہ ہی عمل

بن جاتا ہے۔ خواہش اور حاصل میں فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ علم والے ایسے علم کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ دور کا نظارہ اڑتا ہوا پاس آ جاتا ہے۔ ہمدرد نے ہلچل مچا دی۔ معمولی نے غیر معمولی کی راہ دکھا دی۔

ایک معمولی سا انسان جس کا نام دھیدو تھا، ایک بستی میں ایک بڑکی سے ملا..... گاؤں اور شہروں کی زندگی میں ایسے ہوتا ہی رہتا ہے۔ معمولی سی بات ہے لیکن اس معمولی واقعے کو ایک غیر معمولی شاعر مل گیا..... وارث شاہؔ نے معمولی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

وارث شاہؔ کے اپنے عرفان نے ہیر رانجھے کے قصے کو راہِ سوک بنا دیا۔ ہیر کو پر لگ گئے۔ رانجھے کو رفعت خیال کے گھوڑے پر سوار کرادیا گیا۔ شاعر نے حسن بیات کی وہ گل کاریاں کی ہیں۔ کہ بس یہ اسی کا حصہ ہے۔ جس طرح مثنوی کو قرآن در زبان پہلوی کہتے ہیں۔ اسی طرح عشاق وارث شاہؔ اس کتاب کو قرآن کی طرح حفظ کرتے ہیں۔ اس کی بڑے اہتمام سے تلاوت کرتے ہیں۔ صحیح غلط اس سے بحث نہیں۔ بات یہ ہے کہ معمولی سے کتنا غیر معمولی نتیجہ نکلا۔ آج ہمارے سکار ہیر، رانجھا پر مقالے لکھتے ہیں، ڈاکٹر میٹ کرتے ہیں۔ نہ ہیر ڈاکٹر نہ رانجھا پروفیسر۔ نہ وارث شاہؔ صدر شعبہ، بس ان پر مقالہ نگار ڈاکٹر۔ کتنے بڑے امکانات پیدا کیے ایک چھوٹے سے واقعے نے کہ دھیدو رانجھا گھر سے بھاگ گیا۔ بس وہ گھر سے نکل کر دب کے گھر میں جا پہنچا۔ عرفان کے گھر میں داخل ہو گیا۔ نصیب کی منزلوں کا سفیر ہو، آج وہ ایک بہت بڑی روحانی علامت ہے۔

کیا فطرت اپنے غیر معمولی واقعات کو معمولی تعارف سے شروع کرتی ہے۔ غالباً ایسے ہی ہے۔ ایک بچے نے خواب دیکھا باپ نے کہا، بیٹا اپنا خواب







## گمانوں کا لشکر، یقین کا ثبات کا

اللہ نے یتیم کو کھانا کھلانے کا حکم دیا ہے، ہم یہ نہیں پوچھ سکتے کہ اللہ نے اسے یتیم ہی کیوں کیا؟ اللہ اسے خود ہی کیوں نہیں کھانا عطا کرتا۔ شکوک شبہات کی دنیا میں سوال ابھرتے ہیں۔ یہ کیوں ایسا کیوں نہیں، ایسے ہونا چاہیے تھا۔

شک ایمان کی نفی ہے، دوسرے یقین کا گھن ہے، اور عاقبت اور خدا پر یقین نہ ہو تو، خیال پر اگندہ ہو جاتا ہے، پر اگندہ خیال سماج میں انتشار پیدا کرتا ہے، جب تک انسان کو اپنے عقیدے پر مکمل اعتماد اور اعتقاد نہ ہو، وہ حقیقت کو کیسے تسلیم کر سکتا ہے۔

یقین سے محروم انسان صرف سوال ہی کرتا رہتا ہے، کہ اللہ دن یہ کیوں کیا؟ یسے کیوں نہیں، صاحب یقین یتیم کو کھانا کھلاتا ہے، پورا اسے اپنے نئے سعادت سمجھتا ہے، عقیدے کو ثابت نہیں کیا جاسکتا اسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کا ثبوت اپنی ہی پیشانی میں ذوق سجدہ کی شکل میں ملتا ہے، اگر ذوق جہیں سائی نہ ہو تو عقیدوں کے محل مسمار ہو جاتے ہیں۔ مابعد پر صرف اعتماد ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس کی حقیقت کو ثابت کرنا مشکل ہے۔

آج کے انسان اور مسلمان کے لئے یہ مرحلہ مشکل ہے۔ کہ وہ اپنے عقیدے کو محفوظ رکھے، عقیدہ قدم قدم پر ہاتھ سے نکل جاتا ہے، ہم مانتے ہیں کہ اللہ ہی رزق دینے والا ہے۔ ہم سوچتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ رزق کی تقسیم نامنصفانہ ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ نے کچھ انسانوں کو صرف غریب رہنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ اللہ جس نے سب کے لئے یکساں زندگی پیدا

کی ہورج کی روشنی سب کے لئے ہے۔ سب انسانوں کو ایک ہی صورت عطا ہوئی، پیدائش ایک جیسی، اور موت بھی سب کے لئے یکساں۔ اُس کے خزانے سب کے لئے ہیں۔ لیکن معاشی ناہمواری کا سبب کیا ہے؟ کون ہے جو حق سے زیادہ حاصل کرتا ہے۔ اور کون ہے جو حق سے محروم رہتا ہے۔

ستم کی بات تو یہ ہے کہ امیر آدمی اپنی دولت کو اللہ کا فضل بیان کرتا ہے۔ امیر انسان نا جائز طریقے سے دولت کماتا رہتا ہے، اور ساتھ ہی اعلان کرتا رہتا ہے، کہ اس کی عبادت منظور ہوگئی، اللہ نے رحم فرما دیا۔ وہ بڑا مہربان ہے، یتیم کا مال کھانے و لچک کرتا ہے۔ اور خدا کے گھر میں داخل ہوتا ہے، بڑے یقین کے ساتھ، اللہ کا حکم نہ ماننا، اور اس کے رو برو ہونا اُس کے دوہو ہونے کے برابر ہے۔ امیر آدمی کا غلط یقین، غریب انسان میں دوسرے پیدا کرتا ہے۔ غریب سے عبادت کی دولت بھی چھن جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اللہ تو بس امیر آدمی کا اللہ ہے۔ امیر کی مافرمانیوں کو سزا دینے کی بجائے انہیں انعام دیتا ہے۔ غریب کو صرف غریبی برداشت کرنے کا درس دیا جاتا ہے، یہاں سے عقیدے میں دراڑ پڑتی ہے۔ امیر کی دولت اور دولت کی نمائش غریب کو اللہ کی رحمت سے مایوس کر دیتی ہے۔ لیکن عقیدہ پختہ ہو تو انسان ہر حال سے گزر جاتا ہے، وہ مایوس نہیں ہوتا۔

گمانوں کی تاریک راتوں میں یقین کے چراغ جلتے ہی رہتے ہیں۔ دولت مند انسان میں اگر خوف خدا نہ ہو تو اس کی عاقبت فرعون جیسی ہوتی ہے۔ غریب کا یقین محفوظ رہے تو اُس کے لئے رحمتیں ہیں۔ رزق صرف پیسا ہی نہیں، ایمان بھی رزق ہے، مال فنا ہو جاتا ہے، لیکن ایمان قائم رہتا ہے، ہمیشہ کے لئے۔

اللہ کو، نئے والے ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔ وہ صحت اور بیماری دونوں میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ صاحب یقین ہر حال میں صاحب یقین ہے، وہ جانتا ہے کہ اللہ کریم نے اس دنیا میں ہر رنگ کے جلوے پیدا فرمائے ہیں۔ امیر کے لئے الگ بیماریاں ہیں، اس کے الگ اندیشے ہیں، اُس کی عاقبت الگ مخدوش ہے۔ غریب انسان کے لئے غریبی باعث مدامت نہیں،

امیر غریب کی بحث نہیں، ہر انسان بیک وقت امیر بھی ہے، غریب بھی۔ جو اپنے نصیب پر خوش ہو، وہی خوش نصیب ہے، جس انسان کی آرزو اس کے حاصل سے زیادہ ہو، وہ غریب ہے۔ دیکھنے والی بات صرف اتنی ہے کہ کون اپنی حالت پر مطمئن ہے۔ کون ہے جو اپنی حالت پر راضی ہے، کون ہے جو اپنے ماحول میں صاحب یقین ہے، کون ہے جو گمانوں کے لشکر میں گھرا ہے، کس کا دل اس کی یاد سے آلود ہے۔ کون ہے جو عارضی زندگی پر مغرور ہے، کیا صرف دولت ہی نے انسان کو اپنے رب کے سامنے مغرور کر رکھا ہے۔ امیر غریب ختم نہیں ہو سکتے۔ عقیدے کے قیام کے ساتھ بھی یہ طبقے قائم رہتے ہیں۔ زکوٰۃ دینے والے تب ہی ہے، جب پینے والے ہو، قابل غور بات یہ ہے کہ کون ہے، جو امیر ہو کر خوف خدا رکھتا ہے، اور کون ہے جو یقین کی دولت سے مالا مال ہے، تخلیق میں رنگینی اور حسن اسی وجہ سے قائم ہے، کہ کوئی کسی کے برابر نہیں۔ کوئی کسی کے برابر نہیں ہو سکتا، کوئی، کوئی ارہے گا، مور، مور، اچھا امیر بھی بہت اچھا ہے، برا غریب بھی بہت برا۔ اللہ کے ہاں تقویٰ کی عزت ہے۔

یہ کتنے غور کی بات ہے، کہ جس انسان پر اللہ درود بھیجتا ہے، اس کو قیمتی اور غریبی سے گزرتا پڑا، عجب بات ہے، کہ نبیوں کے نبی ہیں، پیغمبروں کے پیغمبر

ہیں۔ دنیا کے ہر انسان سے زیادہ معزز ہیں۔ اور وادی طائف سے زخمی ہو کر نکلتے ہیں۔ اور اللہ آپ کے ساتھ ہے، بات تقرب کی ہے، تعلق کی ہے، ہر دولت کی نہیں، اگر گھر میں چراغاں ہو، اور دل میں تاریکی ہو کیا حاصل۔ اگر غریبی میں سر یہ یقین مل جائے تو ایسی غریبی پر ہزار خزانے قربان۔

آج کے دور کا سائنس اور فلسفے کی وجہ سے بے یقینی کا شکار ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ کثرت مال کے اندر تنگی حال موجود ہے۔ انسان کو غافل کر دیا ہے کثرت مال نے، حتیٰ کہ وہ قبر میں جا گرتا ہے، اور پھر وہ ان مسرتوں پر غصوں کرتا ہے، جو غریب کو اس کے حق سے محروم کر کے حاصل کی گئیں۔

آج کا ذہن شبہات کی آماجگاہ ہے، شکوک پرورش پا رہے ہیں، گمان پل رہے ہیں۔ دل سوز سے خالی ہو گیا ہے، انسان خدا سے دور ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ وہ دولت کے دیوتا کا بچہ پری ہے۔ کوئی انسان دو آقاؤں کا غلام نہیں ہو سکتا، آج کا انسان کئی آقاؤں کا غلام ہے، دولت کا غلام، اسلحے کا غلام، جمہوریت کا غلام، ہر خوشی کا غلام، انسان اپنی آرزو کے آگے سجدہ کرتا ہے، خدا کے آگے نہیں جھکتا، وہ ایک سجدہ جو انسان کو ہزار سجدوں سے نجات دلاتا ہے، آج کے انسان کو حاصل نہیں ہوا۔

لکھوں مساجد میں صبح شام، دن رات، لاؤڈ سپیکروں پر اسلام پھیلا دیا جا رہا ہے، اور تاثیر کا یہ عالم ہے کہ معاشرہ پر اگندہ ہے، کیا نہیں ہو رہا ہے، کیا نہیں ہو چکا، مبلغ یقین سے محروم ہو تو تبلیغ تاثیر سے محروم ہو جاتی ہے۔ آج بے یقینی ایک وبہ کی صورت اختیار کر گئی ہے، جس انسان کو اپنے آپ پر یقین نہ ہو، وہ خدا پر کیا یقین رکھے گا!

ہم محروم ہو گئے، ان حقیقی مسرتوں سے جو یقین اور صرف یقین سے حاصل ہوتی ہے، جو شخص روزہ نہ رکھے، وہ عید کی مسرت کیسے حاصل کرے، عید کی خوشی دولت سے حاصل نہیں ہوتی، یقین سے حاصل ہوتی ہے۔ روزے کے انکاری جب عید مناتے ہیں تو ان کے چہرے بے نور ہوتے ہیں۔ اُن کے دل بے حضور ہوتے ہیں۔ روزے دار کا چہرہ تابدار ہوتا ہے۔ اُس کا دل حقیقی مسرتوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اُس کا سینہ یقین سے پر نور ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھ میں سرور ہوتا ہے، اس کے سے عید کی نماز، سجدہ بے نیاز ہے، بے نیاز کے حضور۔

دنیا کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں یقین اور شکوک کے معرکے نظر آتے ہیں، صاحب یقین آگ میں چھلانگ لگاتا ہے، اور صاحب گمان دیکھ، دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ کہ آگ گلزار کیسے ہو گئی۔ یقین کے جلوے ایمان والوں کا ٹھکانہ ہے۔

صاحب یقین خوفِ حزن سے آزاد ہوتا ہے، اسے نہ آنے والے کا ڈر ہے، نہ جانے والے کا ملال، وہ صرف اپنے مالک کے عمل کو دیکھتا ہے۔ دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ وہ شکر کرتا ہے کہ اسے شکر کرنے والا بنایا گیا ہے۔

صاحب یقین خرد کی گتھیاں بھی سلجھاتا ہے، اور گیسوئے ہستی بھی سنوارتا ہے، صاحب گمان اپنے دموں کی نذر ہو جاتا ہے۔ اسے نہ یہ زندگی راس آتی ہے، نہ وہ زندگی، جس کے بارے میں اسے شک ہے وہ اندر سے ٹوٹتا رہتا ہے، اور پھر شکستہ جہاز کو کوئی بھی ہوا راس نہیں آتی۔

یقین کی طاقت پتھروں سے نہر نکالتی ہے۔ موت سے زندگی نکالتی



ہے۔ یقین کچے گھڑے کو پکارنگ دیتا ہے، اور گمان محلات میں رہ کر رزنا ہے، خوف زدہ ہوتا ہے ہر اسے رہتا ہے۔

یقین کے ساتھ اللہ ہے، اور گمان کے ہمراہ شیطان، آج کی دنیا میں صاحب کرامت ہے وہ انسان، جو صاحب یقین ہو۔ آج کے دور کی آگ سر دیاہ پرستی کی آگ ہے۔ ہوس پرستی کی آگ ہے، خود پرستی کی آگ ہے، آج کا براجم وہ انسان ہے، جو اس آگ میں گلزار پیدا کرتا ہے، جس کی نگاہ خیرہ نہیں ہوتی۔ جس کی آنکھ میں یقین کے جلوئے ہیں، جس کے دل میں اعتماد ہے، اس ذات پر، جو اس کی مسجود ہے، اس کی محبوب ہے، جو ہمہ حال موجود ہے۔

ہم من حیث القوم بھی یقین سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم میں بندی فکر کا فقدان ہے، اور نتیجہ یہ ہے کہ ہم آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہیں، الجھتے ہیں، صوبوں کی بحث ہے، زبان کی بحث ہے۔ اقتدار کی ہوس نے ہمیں یقین سے محروم کر دیا ہے، ہم کوشش ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ نصیب پر اعتماد نہیں۔ گدھا ہزار کوشش کرے، گھوڑے کا نصیب نہیں حاصل کر سکتا۔ ہم وہائی کو صحت سمجھتے ہیں، اور صحت کو زندگی کا دوام، ہم بھول جاتے ہیں کہ اس فنا کے دیس میں کسی چیز کو قیام نہیں، نہ صحت ہمیشہ رہ سکتی ہے، نہ زندگی۔ ہمیں یقین کیوں نہیں آتا۔ ایک عارضی، مقرر شدہ قیام کے بعد نہ فرعون رہ سکتا ہے، نہ موسیٰ۔ نہ کمزور ٹھہر سکتا ہے، نہ توانا۔ ہم اس زندگی کے لئے جوابدہ ہیں، جو ہمیں ملی ہے، ہم دوسروں کے جوابدہ نہیں ہیں۔ کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا، کسی سے وہ سوال نہیں ہوگا جو اس سے متعلق نہ ہو۔ ہمیں اپنی پیشانی اور مسجود سے غرض ہے، اپنے ایمان اور یقین سے کام ہے۔

ہمیں اپنے دوسروں سے نجات چاہیے، ہمیں اپنے دل سے اپنے عقیدے

پر اعتقاد کرنا ہے۔ خدا سے دولت یقین کا سوال کرنا ہے، الہی ہمیں پھر سے وہی یقین دے، ہمیں پھر سے اپنا ہنا، ہمیں پھر وہی جلوے دکھا۔ ہمارے دل کو پھر سے وہی نور ایمان عطا کر، ہمیں ہمارے گمانوں سے بچا، ہم شبہات کی دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ ہم شکوک کے تاریک راستوں پر آٹکے ہیں۔ الہی ہمیں عطا کر پھر سے کوئی صاحب یقین رہنما، ہم اپنی آرزوؤں کی کثرت کا شکار ہو گئے ہیں۔ یقین کی وحدت عطا فرما، یقین کبھی متزلزل نہیں ہوتا، اس کے پاؤں ڈمگاتے نہیں، اس کے اعتقاد میں کبھی غرر نہیں آتی۔ اسے کوئی دبدبہ ڈرا نہیں سکتا، اسے کوئی پشیمانی نہیں مل سکتی۔ گمانوں کے لشکر میں یقین کا اثبات ایسے ہے، جیسے یزیدی فوج کے سامنے امام حسینؑ کا ایمان، تاریکی کے حصار میں روشنی کا گلاب، یقین بے گمان کا کرشمہ، دولت لڑو ال کا معراجِ سماں۔

## مذہب

سورج سے کسی نے اس کا مذہب پوچھا، وہ خاموش رہا، مسکراتا رہا، سوال

دہرایا گیا

تو سورج نے کہا، آنکھ ملا کے سوال کرو۔ تم سے آنکھ تو نہیں ملا سکتے، تم اتنے تابناک ہو، سورج نے کہا، تم خود سوچو، میرا مذہب کیا ہے۔ سائل سمجھ گیا کہ سورج کا مذہب اسلام ہے، اس کا تذکرہ قرآن میں ہے، پھر اسے معاذ خیل آیا، کہ قرآن میں تو کفار کا بھی ذکر ہے۔ شیطان کا بھی ذکر ہے۔ وہ بڑا پریشان ہوا، اور سورج میں گم ہو گیا، کہ آخر سورج کا مذہب کیا ہے۔ وہ سورج کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ اُسے آواز آئی نادان سورج کا مذہب صرف روشنی ہے، نور ہے۔ یہ مذہب اسے فطرت نے نہیں بلکہ فطر نے عطا کیا ہے، سورج، چاند، ستارے سب اپنے اپنے مذہب پر کار بند ہیں۔ یہ ان کا مذہب ہے، ان کے لئے مدام گردشوں کا مذہب مقرر ہو گیا، اور وہ کفر و اسلام کے تفرقوں سے آزاد ہیں، سب کے لئے یکساں ہیں۔ رنگ و نسل سے آزاد، عذاب و ثواب سے بے نیاز!

اس نے سوچا کہ یہ عجیب بات ہے کہ مذہب سب کا الگ ہے، اور خالق سب کا ایک ہے۔ تعجب ہے ایسے نہیں ہو سکتا، اس نے سوچا اور وہ سوچتا ہی چلا گیا۔ اللہ تو قادر مطلق ہے۔ خالق عظیم ہے، اللہ نے ابلیس کو پہلے دن ہی ٹھہ کیوں نہ کر دیا۔ نہ ابلیس ہوتا نہ یہ بکھیرے ہوتے، یہ رنگ، رنگ کے نیرنگ، یہ فرق ہنر کے فرتے۔ یہ عہد، عہد کے معبد، یہ الگ، الگ سجدے، یہ روپ، روپ کے بہروپ، یہ ایک آدم اور کئی انسان، یہ ایک خدا اور اس کی جدا، جدا عطا، یہ عجب

صورت حال ہے۔ مذہب اور پھر مذاہب۔ اگر سب مذاہب سچ نہیں، تو مذہب کیا ہے؟

مذہب کے نام پر دنیا میں کیا، کیا نہیں ہو چکا۔ مذہب کی آڑ میں کیا، کیا نہیں کیا جا چکا، مذہب کی حفاظت میں کیا، کیا نہیں قربان ہوا، اور پھر مذہب انسان کو یہاں تک سے نکل جاتا ہے۔ لا مذہب بھی اپنے لئے ایک مذہب رکھتا ہے، وہ اپنی ل مذہبیت پر ایسے کار بند ہے، جیسے مذہب والا اپنی مذہبیت پر۔

کافر خود کو اپنے کفر کا مومن سمجھتا ہے۔ اور مومن کبھی، کبھی اپنی کئی کافر نہ حرکات و سادات کو ایمان ہی کا حصہ سمجھتا ہے، وہ صرف لباس مذہبی اختیار کرتا ہے اور اعمال، چھو اعمال کا ذکر چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو! اعمال کا ذکر کیسے چھوڑیں؟ کوئی اور بات کیسے کریں؟ مذہب گناہ کی سزا دیتا ہے۔ گنہگار کو اپنے دامن سے دور نہیں کرتا۔ یہی تو عجبات ہے، کہ مذہب بھی جاری رہے، اور برائی بھی قائم رہے۔ برا انسان اچھا مذہب اختیار کر لینے کے باوجود برا، اور تعجب ہے کہ اچھا انسان مذہب اختیار نہ کرنے کی وجہ سے پھر برا ہے۔ یہی مذہب کی آمریت ہے کہ وہ ایک غیر مبدل نظامِ تعزیر رکھتا ہے۔ جو مذہب کو نہ ماننے اس کے سنے ایک جہنم، نار جہنم، عذاب، عبرت مقرر ہے۔ اور جو مذہب کو ماننے اس کے سنے ایک ایسا راستہ ہے۔ جس پر چلنا اس وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک اللہ مدد نہ فرمائے، اور اللہ کی مدد، مقدر والوں کے حصے میں آتی ہے، آج کا انسان مذہب سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ کیوں مذہب نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ مذہب کی موجودگی میں وہ اپنے گناہوں پر ندامت کرنے پر مجبور ہے۔

وہ حرام مال کماتا ہے، اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ حلال کی کمائی ممکن

نہیں ہے، اور اگر ہے تو بہت کم، بلکہ کم، کم۔ اور جب وہ حرام مال گھر میں لاتا ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ ایک وقت آنے والا ہے، کہ انسان سے اس کے مال اور اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ کہ وہ مذہبی خیال سے دور بھاگتا ہے۔ اور مذہب اس کے اپنے اندر سے آواز دیتا ہے، خبردار تم بھاگ کے کہاں جاؤ گے۔ میں تمہارے ضمیر میں ہوں۔ تمہارے خون میں ہوں۔ تمہارے ضمیر میں ہوں۔ غافل بھاگنے سے کچھ نہیں ہوگا، بٹھہر جا اور غور کر۔ یتیم کا مال واپس کر دے۔ دیکھ اپنے بچوں کو آگ نہ کھلا۔ یہ ناجائز سہائی تیری اولاد کے لئے آگ ہے۔ تیرے معصوم بچوں نے حیرا کیا بگاڑا ہے۔ ان معصوموں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ انہیں عذاب کا قلم نہ کھد۔ رشوت کی دولت تیرے لئے، تیری اولاد کے لئے ایک عذاب ہے۔ ہزار آ، نادان عقل کر، لیکن نادان کیسے عقل کرے۔ مذہب کیا بتائے؟

مذہب نے زندگی میں بڑے انقلاب پکے ہیں، امیر آدمی کو مذہب بڑا راس آیا ہے۔ وہ اللہ سبحانہ، تعالیٰ کی مہربانیاں حاصل کرتا ہے، مال جمع کرتا ہے اور بہت زیادہ جمع کرتا ہے، اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور صرف شکر ہی ادا کرتا ہے، مال تقسیم نہیں کرتا۔ وہ غریبوں کو توکل کی دولت سے مالا مال دیکھنا چاہتا ہے، غریب کو صبر اور استقامت کا سبق دیتا ہے، اسے مال نہیں دیتا۔ وہ بیمار کے لئے دوا کرتا ہے۔ اسے دوائی نہیں دیتا، اور خود بڑے ہسپتالوں میں داخل، خارج ہوتا رہتا ہے۔ اس کے جسم سے خوشبو آتی ہے، اس کا لباس عطر میں ڈوبا ہے، اور دل فکر میں، اسے معصوم ہے کہ جسے وہ مذہب سمجھ رہا ہے، وہ مذہب نہیں ہے۔ وہ مذہب کا لہوہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سچ مذہب لہوہ دے اور نقابوں سے آزاد ہے۔

آج مذہب پر گفتگو ہوتی ہے، بلکہ گفتگوئیں ہوتی ہیں۔ ٹی، وی پر افہام و



تفہیم کے ذریعے مفہوم دین بتایا جاتا ہے۔ اور کسی مبلغ کی بات کسی اور مبلغ کی بات سے نہیں ملتی۔ شاید سب سچے ہیں۔ سب سچے ہیں؟ سب سچے کیسے ہو سکتے ہیں۔ کچھ لوگ سچے ہیں اور کچھ لوگ جھوٹے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک مذہب میں کچھ لوگ سچے ہیں اور کچھ لوگ جھوٹے۔۔۔۔۔ پھر کیا سارے جھوٹے ہیں؟ نعوذ باللہ۔ اللہ ہمیں ہمارے نفس کی شر سے بچائے۔ ہم کیوں جھوٹ بولیں۔ آخر ایک دن ہمیں مرنا ہے، اور پھر موت کا منظر، مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اللہ کی رحمتوں، اور رحمتوں والے نبی کی رحمتوں کو ماننے والے کے لئے مرنے کا منظر اور موت کا منظر رحمت ہی رحمت ہے، لیکن کون مانے؟ مذہب والوں کو یہ بات کیسے سمجھ آئے!

کیا اللہ کی رحمت اس کے غضب سے وسیع نہیں ہے، کیا حضور رحمت مہدیین نہیں ہیں؟ مرنے کے بعد کا عالم، آپ کی رحمت!

اگر رحمت اعمال کے نتیجے سے انسان کو نہ بچائے تو رحمت کا تصور کیا ہے؟ کیا اللہ معاف کرنے پر قادر نہیں ہے؟ کیا مذہب والے اور مذہب سے ٹکار کرنے والے دوزخ میں کبھی اکٹھے ہونگے؟ اگر ہوئے تو کافر مذہب والوں کا مدق اڑائیں گے۔ کہ تم ہمیں کس نجات کی دعوت دیتے تھے؟ خیر چلو اس بات پر کیا بحث۔ جو ہوگا ہو جائے گا۔ جو کچھ کر رہے ہو، کرتے جاؤ۔ بس مذہب کے نام پر ہونا چاہیے۔

ہم ایک یا کسی ایک مذہب کی بات نہیں کر رہے، ہم تو عام طور پر مذہب کی بات کر رہے ہیں۔ اگر انسان کا باطن صادق نہ ہو تو صداقت کا مذہب اسے کوئی فلاح نہیں دیتا۔





## مفروضے، اندازے اور مجبوریاں

کہتے ہیں اور کہنے والے بڑے بزرگ لوگ ہیں۔ اور بزرگوں کے کہے ہوئے میں دوسرے بزرگوں نے اضافے بھی کیے ہیں۔..... تو میں کہہ رہا تھا، کہ کہتے ہیں اضافے کے ساتھ..... کہ ایک بستی میں چار افراد تھے، اُس بستی کی کل کائنات بس یہی چار افراد تھے، مایوں کہیے کہ یہی چار تھکے تھے اس آشیانے کے، بہر حال وہ چاروں افراد اپنے، اپنے احساس اور اپنے، اپنے مفروضے میں بہر تھے۔ اُن کو اپنے فن پر ناز تھا۔ اور ان کا فن ایک اندازہ تھا، ایک مفروضہ تھا، ان کی غالباً مجبوری تھی۔

ان میں ایک آدمی اندھا تھا، بڑا باتونی بڑا فنکار، بڑا ہوشیار، بڑا ناز بھر روز گار۔ اس کے پاس سب کچھ تھا، گھٹگو تھی، جواز تھے، بیانات تھے۔ کیا نہیں تھا اس کے پاس، لیکن مجبوری صرف یہ تھی کہ وہ اندھا تھا، اندھا ہونے کے باوجود اسے اپنی کور چشمی کا احساس تک نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس اسے اپنی دور بینی پر ناز تھا، وہ ستاروں کی بات کرتا، ستارہ شناسی کا ذکر کرتا، دنیا میں ہونے والے ہر واقعہ کو یہ اس کے رو برو تھا۔ کیونکہ اسے تو صرف جھوٹ ہی بولنا تھا۔ اور جھوٹ کیسے کچھ بھی ناممکن نہیں، وہ اپنے تینوں ساتھیوں کو واقعات سناتا، اور انہیں بتاتا کہ ہر چیز اس پر آشکار ہے۔

دوسرا آدمی ہمیشہ دوسرا ہی ہوتا ہے، اندھے کے مقابلے میں دوسرا آدمی بہرا تھا، اسے بہرا ہی ہونا چاہیے تھا، وہ شخص بڑے کمالات کا، لک سمجھتا تھا خود کو، وہ اس کائنات کے نعمات کو سننے کا دعویٰ رکھتا تھا، اور بے چارہ سماعت سے محروم تھا، وہ





ہی تیز رفتار ہے، کسی ریس کے گھوڑے کی طرح۔ بے چارہ مجبور، مفروضہ ہی مفروضہ، اندازہ ہی اندازہ۔ کہانی ختم ہو گئی لیکن کہانی کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں، حقائق ختم ہو جائیں تو بھی کہانیاں جاری رہتی ہیں۔

ایک دن وہ چاروں افراد آپس میں مل بیٹھ کر اپنی بستی کے بارے میں غور کر رہے تھے، اس کی ترقی کے منصوبے بنا رہے تھے، کہ اچانک ڈرامہ شروع ہو گیا۔ بلکہ ڈرامہ سین شروع ہو گیا۔

اندھا بولا، صاحبان! میرے عزیز ہم وطنو! بلکہ غم وطنو! میں دیکھ رہا ہوں، کہ دشمن ہماری طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ ہم خطرے میں ہیں، بلکہ غنیمت آرہا ہے بہر اتانید کرتے ہوئے بولا، ہاں یہ درست ہے، میں دشمن کے ٹینکوں کی آوازیں سن رہا ہوں۔ اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

ننگے نے فوراً اعلان کر دیا، ہاں، ہاں دشمن کیوں نہیں آئے گا۔ اسے میرے قیمتی لباس کی آرزو تھی۔ بڑی دیر سے دشمن موقع کی تلاش میں تھا۔

لنگڑے نے سوچا، اور فیصلے کے انداز میں بولا تو بھائیو سوچ کیا رہے ہو؟ آؤ بھاگ چلیں۔

کہانی یہاں ختم ہو جاتی تو اچھا تھا، لیکن جب سے علامتوں نے کہانی کو بے معنی بنایا ہے۔ کہانیاں ختم نہیں ہوتیں۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اندھا وہ انسان ہے۔ جو اپنے عیب نہیں دیکھ سکتا، وہ اپنے آپ کو پرنکٹ مانتا، اور دوسروں کو گمراہ سمجھتا ہے۔

بہر اوہ انسان ہے، جو وہاں ہے سنتا ہے خوشامد سنتا ہے، لیکن حق کی بات کے  
نے اس کے کان بند ہیں۔ اس کے کان اب کان نہیں ہیں۔

ننگا .. ہر دنیا دار، غریب بے چارہ، خواہشات اور حاصل کے فرق میں  
پریشان، رہنے والے، جس کا ہمیشہ یہی خیال ہے کہ لوگ اس کے حصے کا مال موٹ کر  
لے جائیں گے۔

اور آخری آدمی..... بس مجبوری در مجبوری، حصار وقت کو توڑ کر نکلنے کی  
آرزو۔ لیکن حصار وقت میں پابند رہنے کی مجبوری۔ نکل سکتے ہو تو نکل کر دکھاؤ۔ تم  
نہیں نکل سکتے۔ ہر آدمی اپنے، اپنے حصار میں رہن رکھ دیا گیا ہے۔ لوگ غور کیوں  
نہیں کرتے۔

## ماضی، حال، مستقبل

انسان عجب مخلوق ہے، خیال کو حقیقت بنانا چلا جاتا ہے۔ اور حقیقت کو خیال، بات آسان ہے، مستقبل خیال ہے، ماضی خیال ہے اور حال حقیقت۔ انسان مستقبل کو حال اور حال کو ماضی بنا دیتا ہے۔ خود بخود ہی سب کچھ ہو جاتا ہے۔ بڑے غور فکر کے بعد اس مقصد کی بے مقصدیت دریافت کر لی جاتی ہے۔ اور یوں زندگی علم و عمل، خیال و حقیقت کے مابین کیاتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

یہاں تک تو بات صحیح ہے، کہ انسان پردے سے باہر ہے، اور مستقبل اور ماضی دونوں پردے میں ہیں۔ ایک ٹھیل کے حجاب میں ہے۔ اور دوسرا یا دونوں کے پردے میں، یہی پردہ انسان کو گوارہ نہیں۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اب اور کیا، کیا دیکھنا باقی ہے، وہ اس کو بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ جسے ایک دفعہ دیکھا جا چکا ہے۔ یہ انسان کے بس میں نہیں، جو دیکھ گیا سو دیکھا گیا، اور جو دیکھا جائے گا سو دیکھا جائے گا، جو ہے سو ہے۔

یہ کہہ دینا آسان ہے، لیکن اسے سمجھنا مشکل ہے، جس کا حال بد حال ہے، وہ کسی مستقبل کے خوش حال ہونے کا تصور کیسے کر سکتا ہے؟

مستقبل کی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ کسی حال کے حوالے سے نہیں آتا، وہ اپنا حوالہ خود ہے، وہ جیسے چاہے آئے۔

حاصیوں کے لئے مغفرت لائے، غریبوں کے لئے دولت لائے، عزت کو ڈالیں بدل دے۔ یقین کو سو سو سو یقین بنا دے۔ یہ اس کی مرضی ہے

مستقبل کی مرضی بس خدا کی مرضی ہے۔ خدا کی رحمتوں سے مایوس نہ ہونے کا حکم ہے، بار بار حکم ہے۔ یعنی اپنے مستقبل سے مایوس ہونے کی اجازت نہیں، مستقبل پر بھروسہ رکھو، مستقبل پر امید رکھو، مستقبل رحمت کا نام ہے، انسان کو بات سمجھ نہیں آتی۔ رحمت ہمیشہ ہونے والی ہوتی ہے۔ جب ہو جائے تو انسان اسے اپنا حق کہہ کر

اپنی محنت اور عقل کا پھل سمجھتا ہے۔ کشتی بچکولے کھارہی ہو تو اللہ کو پکارا جاتا ہے۔ جب کشتی کنارے لگ جائے تو اپنی قوت بازو کے قہیدے کہے جاتے ہیں۔

بہت کم انسان ایسے ہیں، جو اپنے حاصل کو پروردگار کی عطیہ سمجھتے ہوں۔..... بہر حال حال کے بد حال ہونے کے باوجود مستقبل کے خوشحال ہونے کی امید ترک نہیں کرنی چاہیے۔

ماضی کے اعمال کے حوالے سے بھی امید اور مایوسی کا پیدا ہونا لازم ہے۔ جب ماضی کے گناہ یاد آتے ہیں۔ تو عداوت کے بوجھ سے سر جھک جاتا ہے، گناہ کے سنے ہی تو مغفرت کا لفظ ہے تو بے گناہ کو ختم کر دیتی ہے۔ تو بے کا مطلب ہی یہ ہے، کہ انسان اس راہ سے ہٹ جائے، گناہ ترک کر دینے کا ارادہ تو بے کا حصہ ہے۔ گناہ نہ کرنے کا فیصلہ تو بے کی عطا ہے۔ تو بے قبول ہو جائے تو گناہ دوبارہ سرزد نہیں ہوتا۔ بلکہ یاد گناہ بھی نہیں رہتی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں، کہ حال کے عمل سے ماضی کا عمل بدل سکتا ہے۔ ماضی کفر ہو تو حال کلمہ پڑھ کے مومن ہو سکتا ہے۔ حال مومن ہو جائے تو ماضی بھی مومن۔

ایک انسان اگر راستہ بھول جائے، بھٹک جائے، پگھڑیوں میں کھو جائے، راہوں کے پیچ و خم میں الجھ جائے۔ اور اگر اسے اچانک منزل کا سراغ مل



حال کی اصلاح کیا ہے، ماضی پر صدق دل سے استغفار اور مستقبل کا خوشگوار انتظار۔ امید و یقین کے ساتھ، اس کی رحمت کی وسعتوں کے سامنے، اس کی لامحدود عطا کے سامنے، اپنی خطا، اپنی کم مائیگی، اور اپنی بے مائیگی کو سرنگوں کر دینا، اس کے انصاف سے ڈرنا، اس کے فضل کا آسرا مانگنا۔ یعنی اپنے اعمال پر بھروسہ کرنے کی بجائے اس کے فضل پر بھروسہ کرنا۔ تاریک راتوں کو سورج کی تابناکی عطا کرنے والے انسان کی زندگی، تیرگی اور مایوسی کو امید کی روشنی عطا کرتا ہے۔ زمین و آسمان کے لشکروں کا، لک ہمارے لئے بہت کچھ رکھتا ہے، شرط یہ ہے کہ ہم اسے تسلیم کریں۔

حال اب ہر ایک لمحہ ہے۔ ایک نقطہ ہے، لامحدود ماضی اور لامحدود مستقبل کا سنگم۔۔۔

لیکن یہ نقطہ دراصل ایک نکتہ ہے۔ حال پھیل جائے تو صدیوں پر محیط ہو جائے، یہ لمحہ حال اپنا راز عیاں کرے تو یہی ازل ہے یہی ابد ہے۔ یہی لمحہ ہمارے فکر و عمل کی آخری حد ہے۔ مستقبل کو ماضی میں بدلنے والی لمحہ اگر چاہے تو ماضی کو مستقبل بنادے۔ یہ کار ساز لمحہ ہے، یہ سراپا راز لمحہ ہے۔ اسی لمحے میں ایک ایسا لمحہ بھی آتا ہے، جب انسان ایسی محفل میں پہنچ جاتا ہے، جو آج کی محفل نہیں، لمحہ پھیل جاتا ہے، اور بعید قریب ہو جاتا ہے۔ لمحے کا پھیلاؤ عجب ہے۔ انسان کو زمان و مکان سے نکال کر لامکاں تک لے جاتا ہے۔ یہی حال کا مختصر ہے! اور پھر انسان دیکھتا ہے۔ اگر انسان خسرو ہو تو اسے نظر آتا ہے کہ خدا خود ہی میری مجلس ہے۔ اور مجمع محفل حضور پر نور۔ یہ نظارہ کسی ماضی یا مستقبل کی بات نہیں۔ یہ حال ہے، حال کا لمحہ تاب ناک لمحہ، مختصر لمحہ، خوش نصیب لمحہ۔



حال کے لمحے کو پہچاننے والے دنیا میں آنے والے زمانے کو جاننے والے ہوتے ہیں۔ حال آگاہ مستقبل آگاہ ہو جاتا ہے۔ حال آشنا ماضی آشنا ہے، حال کا ادراک، ادراک حقیقت ہے اور اگر حقیقت کا ادراک میسر آجائے تو تخیل کا ادراک مل جاتا ہے، یعنی مستقبل کا ادراک آسان ہو جاتا ہے۔ حال سے باخبر ہونے والے یہ دوں کو پہچانتا ہے۔ یعنی ماضی سے باخبر ہو جاتا ہے، حال آشنا کے سامنے ماضی اور مستقبل کے جوئے موجود رہتے ہیں۔

یہ تو صرف حال آشنا کی بات ہے، اور جو انسان حال پر قدرت حاصل کر لے، اس نے ماضی اور مستقبل کو مسخر کر لیا، اس کا مستقبل اس کی اطاعت میں آئے گا۔ حال پر قدرت حاصل کرنا اتنا مشکل ہے جتنا زمین و آسمان کے حصار سے لکھنا، انسان ہرگز نہیں نکل سکتا۔ مگر جسے اللہ توفیق دے، دراصل انسان کی سب قدرتیں توفیق الہی کی کرشمہ کاریاں ہیں۔ وہ جسے چاہے جو چاہے، جب چاہے بنا دے۔

وہ جب چاہے یتیموں کو پیغمبر بنا دے، چاہے تو شاہوں کو درہر کر دے، وہ چاہے تو مکزی کے کمزور جالے سے قوی دلیل پیدا کر دے، چاہے تو مقرب کو معتب کر دے، چاہے تو عاصی کو بخش دے۔ وہ جسے چاہے کیا کر دے،

خافل کو راز آشنا کر دے، جاگنے والے کو محروم کر دے، اور سونے والے کو  
سرفراز کر دے۔ یہ سب اس کے اپنے کام ہیں۔ حال اس کا، ماضی اس کا، مستقبل  
اس کا، نشان اس کا، انسان کا دل اس کا۔ اپنا بتایا ہوا۔ جس دل کو چاہے محرم راز کر  
دے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اور کرتا ہے۔۔۔

ہم ماضی، حال اور مستقبل کے زمانوں میں مقید ہیں۔ اس کے باا ایک ہی زمانہ ہے۔ وہ ہمیشہ ایک حال ہے۔ اس کے جلوے بدلتے ہیں، اس کی ذات نہیں بدلتی، اس نے جس پر فضل کیا وہ بھی قائم کر دیا گیا۔ اس کا حال بھی ماضی اور مستقبل سے واصل ہو کر ایک زمانہ ہو گیا۔ ہر زمانہ، ہر دور، ایک دور، ایک زندگی، ایک کائی، ایک وحدت، ایک جامعیت، اس بات کا کوئی فارمولہ نہیں۔ مجھے میں صدیاں دیکھنے والے ذرے میں محراب دیکھتے ہیں۔ قطرے میں قلم دیکھتے ہیں۔

اس میں صرف کسی کے ہو جانے کی بات ہے۔ بس اتنی سی دیر لگتی ہے جتنی غالب کو اس شعر کے کہنے میں۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البھر

ہم ان کے ہیں، ہمارا پو چھنا کیا۔

ایک بار دل سے تسلیم کر لیا جائے تو حجاب اٹھ جاتا ہے، پردہ اٹھ جاتا ہے، ماضی، حال اور مستقبل ایک شے کے نام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور وہ شے امر الہی ہے۔ امر الہی کو توفیق الہی سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

## بلا سبب

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس دنیا میں نہ کوئی انعام ہے نہ سزا، یہاں صرف وجوہات ہیں اور نتائج، انسان کا ہر عمل یا تو کسی سبب کا نتیجہ ہے، یا کسی نتیجے کے نئے نیا سبب۔ اسباب و نتائج کا یہ سلسلہ زندگی کا مقدر بن کر رہ گیا ہے، انسان جتن عمل کرے گا تنہا ہی حاصل کرے گا، محنت کرنے والا کامیاب ہوگا، تلاش کرنے والا حاصل کرے گا۔ مانتے والے کو دیا جائے گا، کھٹکتے والے کئے لئے دروازہ کھول جائے گا، بس عمل کرتے جاؤ، نتیجہ حاصل کرتے جاؤ۔ برے اعمال کو برا نتیجہ ملے گا، اچھے اعمال کو اچھا۔

زندگی کا یہ تصور اپنی جگہ درست، لیکن زندگی اپنے دامن میں اسباب و نتائج کے رشتوں کے علاوہ بھی بہت کچھ رکھتی ہے۔ زندگی میں بے سبب نتائج اور بے نتیجہ اسباب کی اتنی کثرت ہے، کہ اسباب و نتائج کا سلسلہ قائم رہنا مشکل ہے۔ یہ ت روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ یکساں محنتیں یکساں نتیجہ پیدا نہیں کرتیں۔ ایک، کیٹ میں دکاندار صبح سے شام تک یکساں محنت کرتے ہیں، اور شام کو نتیجہ یکساں نہیں ہوتا۔ ایک کو نقصان اور دوسرے کو نفع، اپنے گھر کو پرسکون بنانے کے لئے سبب کوشش کرتے ہیں۔ لیکن سارے گھر پرسکون نہیں ہوتے، محنت ہوتی ہے لیکن سکون نہیں ملتا۔

سکون یا اطمینان محنت کا نتیجہ نہیں، یہ نصیب کی عطا ہے، اگر انسان کی زندگی میں نصیب، مقدری امثلے الٹی کا دخل نہ ہو تو اسباب و نتائج کا رشتہ سائنس کے اصول کی طرح ہمیشہ قائم رہتا لیکن ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ انسان کے عمل

میں فطرت کا دخل ہے، گردش روزگار کا دخل ہے، حالات زمانہ کا دخل ہے۔

کوشش اپنی ذات تک تو نتیجہ دے سکتی ہے۔ لیکن جب انسان دوسرے انسانوں سے متعلق ہوتا ہے تو کوشش کے باوجود متوقع نتائج برآمد نہیں ہوتے، انسان اپنے راستے پر صحیح سفر کر رہا ہو تو بھی اسے کسی اور کی غلط روی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ حادثہ سبب کو نتیجے سے محروم کرنے والے واقعہ کا نام ہے۔ اور زندگی حادثات کی زد میں رہتی ہے۔ یہ چراغ ہمیشہ نامعلوم اندھیوں کی زد میں رہتا ہے۔ اسی طرح اگر نصیب ساتھ دے اور کوئی شعیب میسر آ جائے تو شبانی کو کلیسیا بنا دیا جاتا ہے۔ اس میں محنت کا استحقاق نہیں، یہ تو ازلی نصیب ہے۔ یہ قدرت کے اپنے جھوٹے ہیں۔ فطرت کا اپنی عطا ہے، مالک کی اپنی منشا ہے، ہر محنت کرنے والے ہماراد نہیں ہو سکتا، دنیا میں بے شمار محنتیں رایج ہیں ہو کر رہ گئیں۔ بے شمار مسافر منزلوں سے محروم رہے۔ بے حساب اسباب اپنے نتائج نہ دیکھ سکے۔ کم و بیش ہر انسان زندہ رہنے کیسے جدوجہد کرتا ہے۔ اور زندہ رہنے کی کوشش نے ہی انسان کو موت تک لانا ہے۔ یہ ایسا نتیجہ ہے جو اپنے سبب کے بالکل برعکس ہے، زندگی پیدا کرنے والے کا یہ ارشاد ہے، کہ وہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔ وہ جسے چاہے ملک عطا کرے، اور جسے چاہے معزول کر دے۔ وہ جسے چاہے بے حساب رزق دے، جسے چاہے اس کے گناہ معاف کر دے، اور اس کی سابقہ برائیوں کو اچھائیوں میں بدل دے، جسے جب چاہے پیدا فرما دے اور جب چاہے اسے واپس بلا لے،

خالق کا عمل انسانی زندگی میں شامل رہتا ہے، اور خالق کا عمل کسی سبب کا محتاج نہیں۔ وہ خود مسبب ہے، اور قادر مطلق ہے۔ اسی لیے انسانی زندگی اسباب و نتائج کے ذریعے قائم نہیں رہتی، دو کسان اپنے، اپنے کھیت میں ہل چلاتے

ہیں، بیچ بڑھتے ہیں، بارش کا انتظار کرتے ہیں، مبادلہ برستے ہیں، ایک کھیت سیراب ہو جاتا ہے، اور دوسرا خشک رہتا ہے، یہ عمل ہر سطح پر ہے۔ زندگی میں ایسے واقعات بھی دیکھے گئے ہیں، کہ ایک سبب کبھی ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے، کبھی دوسرا نتیجہ۔ پہلے سے بالکل مختلف اور برعکس! زندگی کو سائنس بنانے والے، زندگی کا وزن و رموز بنانے والے، زندگی کو ریاضی کیا اصول بنانے والے لوگ، زندگی کی نفسی، زندگی کے حسن، زندگی کے طبع اور زندگی کے باطن کی جلوہ گری سے اکثر محروم رہتے ہیں۔ زندگی صرف، حصول ہی نہیں، حسن بھی ہے، محبت بھی ہے، جہود بھی ہے، ہمارے اعمال کیا، اور ہمارے نتیجے کیا؟ اس کا فضل نہ ہو تو انسان اپنے عمل کے زعم میں ہی تباہ ہو جائے۔

کیا گمراہ ہونے والا راستہ طے نہیں کرتا، کیا گنہگار معنت نہیں کرتا؟ کیا غلطی عمل نہیں ہے؟ کیا حادثے کرنے والا معنت نہیں کرتا؟ کیا ساری سیاسی جماعتیں معنت نہیں کرتیں؟ کیا کچھ محنتیں رائیگاں نہیں جاتیں؟ کیا ہر سبب نتیجہ دے سکتا ہے؟ کی اہرج اگتا ہے؟ کیا ہر عالم دانا ہوتا ہے، کیا ہر سفر آسودہ منزل ہوتا ہے؟ کیا مخلص دوستوں کا میسر آنا کسی سبب کا نتیجہ ہے؟ کیا حالات زمانہ کا سازگار ہونا ہمارے عمل کا نتیجہ ہے۔ کیا خوبصورت چہرہ انسان کا اپنا عمل ہے؟ کیا مکھی نے معنت کر کے شہد بنانے کا ذرمول حاصل کیا؟ کیا ستارے اور سیارے سفر کرتے، کرتے تھک تو نہیں گئے؟ کیا چاند اور سورج کسی اور سبب کے نتائج ہیں؟ کیا بنانے والے نے زندگی میں دخل دینا چھوڑ دیا ہے؟ کیا علاج نے بیماری کو مسخر کر لیا ہے؟ کیا دوا سائنس بن گئی ہے؟ کیا دوا کی ضرورت ختم ہو گئی ہے، کیا انسان بھول گیا ہے؟ کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے اس کا ذکر تک نہیں تھا، اور آج سے کچھ عرصہ بعد پھر اس کا

ذکر تک نہیں ہوگا؟ کیا انسان سبب اور نتیجے کے حوالے سے فطرت اور فطر سے باغی تو نہیں ہو رہا؟ کیا غرور نفس انسان کو اس مقام تک لے آیا ہے، جہاں وہ اپنے بازوؤں کو قادر سمجھ رہا ہو؟ اپنی قوت کو اپنا مقدر سمجھ رہا ہو؟ کیا وہ جانتا نہیں کہ پسند کی جانے والی ہر چیز اس کے لئے مفید نہیں، اور نا پسند ہونے والی ہر چیز اس کے لئے مضر نہیں، کیا انسان کو یاد نہیں کہ فرعون کے تمام اسباب، اس کی تمام تر کوشش، اس کے لئے وہ نتیجہ مرتب نہ کر سکی، جس کی اسے ضرورت تھی؟

یہی عجیب بات ہے، کہ سبب فرعون ہو تو نتیجہ موٹی نکلتا ہے، اور یہی بات اہل ظاہر کی سمجھ میں نہیں آتی، جہاں سبب اور نتیجہ کی سائنس ختم ہوتی ہے، وہاں سے رضا اور نصیب کی حد شروع ہوتی ہے، اور رضا، رضا ہے چاہے تو محنت کو مراد دے، اور چاہے تو محنت کے بغیر یا مراد کر دے۔

بے عقیدہ انسان صرف سبب کو مانتا ہے، اور صاحب عقیدہ انسان مسبب پر ایمان رکھتا ہے۔ بے عقیدہ انسان عوام سے قوت مانگتا ہے، صاحب ایمان جانتا ہے کہ طاقت کا سرچشمہ اور قوت کا مرکز اللہ کے علاوہ کوئی نہیں، اسباب و نتائج کا کہیں، رضا اور قضا کی زد میں رہتا ہے، اپنے اعمال کو دعا کے سہارے سے محروم نہ ہونے دیا جائے، دریا عبور کرنے کیلئے کشتی ضرور سبب ہے، لیکن گرواب سے نکلنے کیلئے دعا کا سفینہ چاہیے۔



## پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں

کرگس و شہین اپنی بلند پروازی کے کسی دائرے میں ایک ساتھ ہو گئے، وہ پاس، پاس، ساتھ، ساتھ تیرتے چلے جا رہے تھے، ان میں گفتگو کا ہونا فطری امر تھا۔

شہین نے کہا: بھی کیسی ہے یہ فضائے نیلگوں، ردائے صبح و شام، یہ وسعت نگاہ، یہ بند پروازی، اور اس کے ساتھ یہ بلند فکری و بلند نظری؟

کرگس جو اپنے خیال میں ڈوبا ہوا نظریہ ضرورت کے متعلق سوچ رہا تھا، بولا ہاں بھی بلندی ہی بلندی ہے، لیکن بلندی اور صرف بلندی ہی تو زندگی نہیں۔ زندگی زندہ رہنے کا عمل بھی تو ہے۔ اس میں اور بھی ضروریات ہیں۔ وسعت نگاہ اپنی جگہ پر بجا، لیکن ضرورت وجود سے کیا انکار، یہ بلند پروازی مجھے میری ضرورت سے محروم کر رہی ہے۔ دیکھو بھی خالی بلندی اور خالی پیٹ ہمیں کیا دے سکتے ہیں؟

شہین نے کہا، دیکھو وہ دو رافق پر جھلمل جھلمل کرنے والے کیا ہے؟ کتنا خوبصورت ہے یہ منظر، کتنی لطیف ہے یہ فضا۔ آؤ بھی ستاروں کی دنیا میں چکر لگائیں، آؤ دیکھیں سورج کہاں سے نکلتا ہے۔ کہاں ڈوبتا ہے؟ آؤ راز ہائے سر بستہ دریافت کریں۔ آؤ معلوم کریں کہ یہ سب کیا ہے؟ یہ آبادیاں کیا ہیں، کیوں ہیں، کون ہے جو ہر شے کو حرکت عطا کرتا ہے، کس نے سب کو اپنے محور اور مدار میں جکڑ رکھا ہے؟ آؤ تو ذرا دیکھیں، اس کا اپنا مدار کیا ہے؟ طاقت صرف طاقت ہے تو اس کی اپنی ضرورت کیا ہے؟ اگر اس کی بھی اپنی کوئی خواہش ہے تو وہ طاقت کیا

ہے؟ اور اگر اس کی اپنی کوئی ضرورت نہیں، تو یہ سب ظہورِ غیر ضروری ہے۔ تو اس راز سے پردہ اٹھائیں۔

کرگس نے شہین کی بات سنی تو بڑے غور سے، لیکن اس بات کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے بجائے ایسا اپنی مردار ٹہنی کے حوالے کر دیا۔ اور کہا کہ اتنی دور کی باتیں نہ سوچا کرو۔ مجھے بھوک لگی ہے، میں کب سے بھوکا پیاسا تیرے ساتھ چکر لگا رہا ہوں،

اور بھوک سے مجھے خود چکر آرہے ہیں، زندگی کا کوئی راز نہیں، یہ صرف زندگی ہے۔ سے گزارنا ہے بہر صورت، زندگی صرف آگ ہے، اور یہ آگ زندگی کے ہر حصے میں ہے، دل میں، دماغ میں، نفس میں، اور سب سے بڑھ کر پیٹ میں۔ پیٹ کی آگ کو بجھانا، آسمانوں کی پرواز سے بہتر ہے۔ یہ ہند پر وازیاں مہمل ہیں۔ اگر پیٹ خالی ہو تم ستاروں اور سورج کا کھوج لگاؤ، وہ تمہاری منزل ہوگی۔ لیکن میری منزل میرے سامنے ہے۔ وہ دیکھو ایک مرا ہوا گھوڑا پڑا ہے، میری برادری کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ اس لیے میں بھی نظریہ ضرورت کے تحت اپنی منزل کی طرف چل ہوں۔ تجھے اور تیری پرواز کو خدا حافظ۔

یہ کہتے ہوئے کرگس نے ایک سیدھا غوطہ زمین کی طرف لگایا، اور اناؤنا  
اپنی منزل مردار تک پہنچ گیا۔ اور شاہین بدستور رازہائے سر بستہ کی تلاش میں، بند  
سے بند تر کی جستجو میں وحدت و یکپائی خیال کے تصور میں زندگی اور، ورائے زندگی  
کو جاننے کی آرزو میں سرگرداں ہے۔ وہ عالمِ خمیر میں گم ہے۔ اس کے سامنے صرف  
فصلے اور وسعتیں ہیں۔ لیکن وہ پرواز میں ہے، اس کی منزل۔۔۔ وہ منزلوں سے  
آزاد ہے۔ منزلِ قی و ہے اور پروازِ آزادی ہے۔

کرگس اور شاہین اکٹھے پرواز کریں تب بھی الگ، الگ راستوں کے مسافر ہیں، 'ن' کو ساتھ، ساتھ بھی دیکھا جائے تو بھی انہیں ساتھ نہ سمجھا جائے، یہ ہم پرواز تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہم مشرب نہیں، ہراز نہیں، ایک کا مقصد مکاں، اور دوسرے کا مقصد مکاں ہے، ایک محمدود، دوسرا احمدود۔ ایک کا رزق مردار، دوسرا دل کا شہنشاہ۔ ایک موت سے وابستہ ہے۔ دوسرا آزادی ہی آزادی کے ساتھ۔

زندگی کے ہر شعبے میں کرگس اور شاہین ساتھ، ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ ہر شعبے میں، ہر طبقے میں، ہر گروہ میں، ہر درجے اور زاویے میں۔

فوج میں بھی شاہین ہیں، کرگس ہیں۔ شہباز وہ جرنیل ہے جس کا مدد ملک کے علاوہ کچھ اور نہ ہو۔ اور گدھ جرنیل وہ ہے جس کا مدد اپنا پیٹ بھرنا۔۔۔ اپنا دوزخ، کبھی، کبھی اپنا حاصل ملک کی محرومی بن سکتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم، خالد بن ولید سب شاہین جرنیل تھے۔ اور بھی کتنے اسمائے گرامی ہو سکتے ہیں، ایسے جرنیل بھی گزرے ہیں جن کا سب سے اچھا کام یہ تھا کہ وہ گزر گئے۔ انہیں زندگی میں صرف ایک ہی چیز زرب دیتی تھی، کہ بس زندگی کو چھوڑ دینا۔

مسد نوں کے قافلے میں شاہینوں کے بیروں پر کرگسوں کا قبضہ سا ہو چکا ہے۔ مشائخ کرام ہی کو لیجیے۔ بس نازک بات کو نہ ہی بیان کیا جائے۔ لیکن یہ بات اتنی نازک بھی نہیں۔ کہ اقبال بہت پہلے اسے کئی بار کہہ چکا ہے کہ خانقاہ میں صوفی خد ہے، خرقہ سالوں کے اندر مہاجن ہے۔ یہ طریق خانقاہ ہی اصداغ طلب ہے، اور کتنے ایسے اقوال۔

مشائخ پیر و کار ہیں ان صادق مشائخ کے جن کے نام سے کام نکلتے رہے

ہیں۔ لیکن آج ان سچے بزرگوں کے آستانے پر کہیں، کہیں جھوٹے دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ کوئی اتارا زبھی نہیں، ہر شیخ اپنے علاوہ سب کو غیر مصدقہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح تمام مشائخ دوسرے تمام مشائخ کی رو سے غیر مصدقہ ہیں۔ اگر سارے سچے ہوں سارے شاہین ہوں تو ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے نہ ہو۔ شہباز طریقت وہ شیخ ہے جو کم زکم قصر سطلانی کے گنبد پر نشیمن نہ بنائے۔ حق گو اور قصیدہ گو میں جو فرق ہے اسے رہنے قائم رہنے دیا جائے۔

علمائے کرام کا تذکرہ کیا کیجیے۔ ان کا کام بس اتنا ہی ہے، جتنا یہ کر رہے ہیں۔ بس ان کا نام رکھنا باقی ہے۔۔۔ علمائے حق یا علمائے س۔

علمائے حق کلمہ حق کہنے کے لئے پیٹ کی ضروریات کو مقدم نہیں سمجھتے۔

وکیلہ خورن لم وین، نہ عالم ہے، نہ دین آشنا۔ وہ صرف ایجنٹ ہے، اور ایجنٹ علم حق نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اس خبقے میں شاہین بھی موجود ہیں، اور کرگس بھی۔ وہ علماء جو واقعی علمائے حق ہیں، بلند نگاہ اور بلند پرواز ہیں۔ وہ طہر اور باطن کا فرق نہیں رکھتے۔ وہ مساجد کو اللہ اور اللہ کے رسول کی تعریف کے لئے وقف سمجھتے ہیں۔ انسانوں اور حکمرانوں کی ہر حال میں قصیدہ سرائی عالم حق کا کام نہیں ہے۔

اسی طرح اساتذہ، ادیب، دانشور، سیاست دان اور بڑے تاجر اور کارخانہ دار سب میں کرگس اور شاہین ہیں۔ ہر سطح پر یہ کھیل ہو رہا ہے، جب انسان پیٹ اور صرف پیٹ بن جائے تو وہ کرگس صفت ہو جاتا ہے، جب اسے ذوق پرواز ملے، وہ ایسے رزق کو بھی نگاہ میں نہیں لاتا، جس سے اس کی پرواز میں کوتاہی آئے،

شاہین صفت انسان مردار نہیں کھا سکتا، وہ صرف پرواز ہے۔ اور پرواز بھی

اس کے ساتھ، اس کی طرف، جس نے قوت پر واز دی۔ جس کی کوئی منزل نہ ہو، اس کی منزل اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔

کرگس اور شاہین، شاہین اور کرگس معاشرے میں باہم موجود ہیں۔

دونوں کی پرواز اسی ایک فضا میں رہتی ہے، مقصد کا جہان الگ، لگ، ہے، ایک آسمانوں پر جھپٹتا ہے اور دوسرا مردار پر لپکتا ہے۔ ان کا مزاج الگ، ان کی داستان الگ، شاہین کی بات کرگسوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی، شاہین کا خواب ہو تو تعبیر کرگسوں کے بس میں نہیں۔ شاہین کا مدعا، شاہین کو ہی معلوم ہو سکتا ہے، پاس رہنے والے دور کے فاصلوں کے مسافر ہوتے ہیں، شاہینوں کے مسکن پر اگر کرگسوں کا بسیرا ہو جائے تو سمجھ لیجیے قیامت کی نشانی ہے، اگر بلند مرتبت بند نگاہ نہ ہو تو وہ وقت اچھا نہیں ہوتا، شاہین کے خواب کی تعبیر اور تفسیر کے لئے

کوئی شہین ملے تو بات بن جائے ورنہ یہ بات جھوم کر گسان کے بس  
میں نہیں ع

کرگس کا جہاں اور ہے شاپن کا جہاں اور

## گردش تیز ہے ساقی

ترقی کا زمانہ ہے، تعمیر کا دور ہے، تیزی کا وقت ہے، تخیل کی گھڑی ہے۔ ہر شے بھاگے چلی جا رہی ہے، گردش زمان و مکان تیز تر ہے۔ انسان مشین ہے مشین کا پرزہ ہے، جلد باز ہے، جلد رفتار ہے، اس کے سامنے لامحدود فاصلے ہیں، وروقت محدود ہے، اس نے وہ دوڑتا ہے، اور دوڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ انسان کو یہ تو معلوم ہے کہ اسے جلدی جانا ہے، لیکن کہاں جانا ہے اسے معلوم نہیں۔

انسان شاید تعمیر حیات کے لئے جلدی کرتا ہے۔ اسے فوری طور پر زندگی مکمل کرنا ہے۔ وروہ جلدی، جلدی اسے بناتا ہے، بناتے، بناتے بگاڑتا ہے، اور اس کے ہاتھ سے زندگی یوں نکل جاتی ہے، جیسے ہاتھ سے کبوتر اڑ جائے۔ یا ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں۔

انسان فطرتاً جلد باز ہے، وہ آہستہ روی یا میا نہ روی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ایک ہی دن میں سارے کام ختم کرنا چاہتا ہے، پوری تیس دن طویل انتظار کے بعد اسے تنخواہ ملتی ہے، اور اسے وہ ایک ہی دن میں خرچ کر دیتا ہے، اور پھر وہی انتظار۔۔۔۔۔ تنخواہ کے علاوہ آمدن کا انتظار۔۔۔۔۔ جائز آمدنی اور ناجائز آمدنی کا انتظار۔۔۔۔۔ انسان بھاگتا ہے، جیسے اس کے اندر آگ سی لگی ہو۔۔۔۔۔ جب خطرہ اندر ہو تو باہر کی رفتار اسے کیسے لے گی؟

تیز رفتاری ہی شاید ترقی کا دوسرا نام ہے، تیز رفتاری نے فاصلے سمیٹ دیے ہیں، انسان، انسان کے قریب آ رہا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے آپ سے دور ہو رہا ہے۔ ہر شے دوسری شے کے قریب ہے۔ یہ تیز مسافرت، یہ جہاز، یہ نکلستان،





بہر کی کائنات نے انسان کو اندر کی کائنات سے غافل کر رکھا ہے۔

خارجی کائنات میں رفتار ہے گردشیں ہیں، عجلت ہے، زہان و مکاں کی وسعتوں میں ہر شے تیزی سے متحرک ہے، انسان اس حرکت سے خود ہی متحرک ہو جاتا ہے، وہ لپکتا ہے ستاروں پر، وہ دوڑتا ہے سایوں کے پیچھے، بھاگتا ہے سراپوں کے تعاقب میں، وہ چاہتا ہے کہ وہ راز ہائے سر بستہ معلوم کر لے۔۔۔ لیکن اسے معلوم نہیں، کہ وہ خود ہی اسرارِ کلید ہے، وہ خود شاہکارِ تخلیق ہے،

حسن ل زوال کا مرقع جمال ہے۔ جب تک وہ اپنا راز دریافت نہ کرے، وہ راز کائنات معلوم نہ کر سکتا۔۔۔ اس کا بیرونی سفر تیز رفتار ہے، لیکن اندرون کا سفر کسی عجلت کا تقاضا نہیں کرتا، اس کی باطنی کائنات، داخلی دنیا، ہر بیرونی ظاہری اور خارجی کائنات سے زیادہ وسیع و عریض ہے۔ زیادہ خوبصورت ہے، زیادہ دل چسپ اور دل پذیر ہے۔

رفتار کے سفر نے انسان کو اس کے اصل سفر سے الگ کر دیا ہے۔ انسان خود ہی رو بوٹ بن کے رہ گیا ہے۔ وہ ملک، ملک پھرتا ہے، سکون کی تمنّا میں، شہر، شہر، مگر مگر چھٹتا ہے۔ دولت کی تلاش میں۔۔۔ وہ ملک دہری کا راستہ نہیں جانتا، جہاں دولت تسکین کے خزانے مستور ہیں۔ تیز رفتار انسان سایہ دیوار یا رستے محروم ہے،

آج کا انسان تمام تر آسانشوں اور رفتاروں کے باوجود اکابرینِ سلف تک نہیں پہنچ سکا، دستورِ حیات کی اساس، ماضی کے عظیم انسانوں نے رکھی، آج کی عمر تاسی بنیاد پر قائم ہے، لیکن آج کا انسان اس عمارت کو جلد مکمل کرنا چاہتا ہے، اور تکمیل تہذیب، اختتام تہذیب ہے۔







## سوال یہ ہے کہ.....

کیا زندگی دینے والا زندگی واپس لینے کے علاوہ بھی اس پر کوئی اختیار رکھتا ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟

کیا خالق مخلوق کے تجربے یا مشاہدے میں آ سکتا ہے؟

کیا خالق مخلوق کی آواز اور پکار پر ان کی امداد کرتا ہے؟

کیا ہمیشہ ایسے ہوتا ہے؟

کیا خالق اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں تخلیق کے حوالے سے کوئی تمیازی سوک کرتا ہے؟

کیا ہر انسان کو یکساں صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے یا الگ الگ صلاحیت کے ساتھ؟

کیا بد صورت اور خوب صورت انسان ہوتے ہیں؟

کیا بد صورت کسی غلطی کی سزا کے طور پر بد صورت پیدا ہوتا ہے اور خوب صورت کسی نیک کے دم سے خوب صورت ہوتا ہے؟

کیا پیدائش سے پہلے بھی کوئی نیک بدی ہوتی ہے؟

کیا انسان کے اژدہام میں ایک آدمی اپنے ایمان کے حوالے سے اپنا تمیاز ثابت کر سکتا ہے؟





کیا کسی پیغمبر کی کوئی دھانا منظور ہوئی ہے؟

کیا کسی کافر کی کوئی آرزو کبھی پوری ہوئی ہے؟

کیا ہماری محنت نصیب کے تابع ہے؟

کیا نصیب محنت کے تابع ہے؟

کیا نصیب بدل سکتا ہے؟

کیا نصیب کو بدلنے والی شے بھی نصیب ہی کہلاتی ہے؟

کیا نصیب کو نصیب بدلتا ہے؟ کیا وہ نصیب ہوتے ہیں، تبدیل کرنے والے

اور تبدیل ہونے والا؟

کیا بیماری دعا سے دور ہوتی یا دوا سے؟

کیا وقت بدلنے کا کوئی موسم ہوتا ہے؟

کیا امید اور خوف کے زمانے ہوتے ہیں؟

کیا سکون آسمانوں سے نازل ہوتا ہے یا یہ اپنے خیال سے حاصل ہوتا

ہے؟

کیا سکون خود گریزی کا نام ہے یا بے عملی کا عمل؟

کیا ایمان والے کافروں کی بنائی ہوئی آسائشیں خرید سکتے ہیں؟

کیا امپورٹ اور ایکسپورٹ کا سارا نظام قابل غور تو نہیں؟

کیا یہود سے اسلحہ لے کر خود کے خلاف جہاد کیا جاسکتا ہے؟

کیا ایک مسلمان ملک دوسرے مسلمان ملک کے خلاف جہاد کر سکتا ہے؟

کیا مومن ہونے کے لیے کسی ادارے سے سند یافتہ ہونا ضروری ہے؟

کیا ہم کسی ایسے شخص کو کافر کہہ سکتے ہیں، جو خود کو مومن کہے؟

کیا اعمال کو نیت سے پہچانا جاتا ہے یا نتیجے سے؟

کیا نیت جاننے کا بھی کوئی علم ہے؟

کیا خط ہر اور مخفی لگ، لگ علوم ہیں؟

کیا مجبور کا گناہ ہوتا ہے؟

کیا بے بس جوابدہ ہے؟

کیا پابند، آزاد کہہ سکتا ہے؟

کیا عبادت عابد کی مجبوری ہے کیا اختیار؟

کیا کائنات کی ہر شے خالق کی تسبیح بیان کر رہی ہے؟

کیا تسبیح بیان کرنے والی شے باغی ہو سکتی ہے؟

کیا سرکش کو سرکشی فطرتاً نہیں ملی؟ اگر فطری امر ہے تو گناہ کیسے؟

اگر ایک مسلمان ملک کسی غیر مسلم کے خلاف جہاد میں مصروف، تو کیا

دوسرے مسلمان ممالک پر جہاد فرض نہیں ہو جاتا؟

کیا مسلمان قوموں کا ایک ملک بننے کا کبھی موقع مل سکے گا؟ کیسے؟

کیا مسلمانوں کا حج غیر مسلموں کو فائدہ تو نہیں پہنچاتا؟ حج ہمارا، جہازن کے سامان ان کا، تجارت ان کی۔ کیا مسلمان کیا تیل یہودی کے ٹینکوں میں تو استعمال نہیں ہو رہا؟

کیا ہمارا مستقبل سب مسلمانوں کا مستقبل ہے؟

کیا سچے دین کو ماننے والے ہمیشہ سچ بولتے ہیں؟

کیا مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں؟

کیا مسلمان معاشرہ قائم ہو چکا ہے؟

کیا مسلمانوں پر اسلام نافذ ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے یا نہیں ہو سکتا؟

کیا آج اسلام کی حالت وہی ہے، جو چودہ سو سال پہلے تھی؟

کیا ترقی کرنے کے لیے مذہب کا ہونا بہت ہی ضروری ہے؟ کیا ال مذہب لوگ ترقی نہیں کرتے؟

کیا مذہب حاصل ہونے کے بعد ترقی ضروری ہے؟

کیا ترقی کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا؟

ترقی کا معیار کیا ہے؟ کافر معاشرے کی تقلید یا مذہب پر سربِ سرچ؟

کیا آج کے ترقی یافتہ ممالک کوئی مذہب رکھتے ہیں؟

کیا آج کے پسماندہ ممالک میں مذہب کے چرچے زیادہ ہیں؟

گھر سے قبرستان تک کا فاصلہ طے کرنے کے لیے کتنی ترقی چاہیے؟

کیا قوم میں وحدت افکار اور وحدت کردار پیدا کرنے کے لیے عذاب

کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہو سکتا؟

کیا خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی بڑی مخلوق بھی ہے، جو خالق جیسا حکم

رکھتی ہو؟

کیا خالق نے مخلوق کو مخلوق کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے؟

کیا خالق مخلوق سے ناراض ہے؟

کیا خالق مخلوق کو معاف نہیں کر سکتا؟

کیا اس کی رحمت اس کے غضب سے زیادہ وسیع نہیں ہے؟

اہل ظاہر کو ان سوالات کے جوابات سوچنے پڑھتے ہیں۔ اہل باطن پر

جواب پہنچے آشکار ہوتا ہے، سوال بعد میں بنتا ہے۔

اگر جواب معلوم نہ ہو تو سوال گستاخی ہے اور اگر جواب معلوم ہو تو سوال

بے باکی ہے۔ بے باکی میں تعلق قائم رہتا ہے اور گستاخی میں تعلق ختم ہو جاتا ہے۔

اگر ہم ذہن سے سوچیں تو سوال ہی سوال ہیں اور اگر دل سے محسوس کریں

تو جواب ہی جواب۔

اگر ہم اس کے ہیں تو وہ ہمارا ہے۔ جواب ہی جواب۔ اگر ہم صرف اپنے سے ہیں تو ہم پر عذاب ہے۔ علم کا عذاب، ذہن کا عذاب۔ سوال ہی سوال۔

سوال دراصل ذہن کا نام ہے اور جواب دل کا نام۔ ماننے والے جاننے کے لیے بہت تاب نہیں ہوتا اور جاننے کا متمنی ماننے سے گریز کرتا ہے۔

شک سوال پیدا کرتا ہے اور یقین جواب مہیا کرتا ہے۔ شک یقین کی کمی کا نام ہے اور یقین شک کی نفی کا نام۔ یقین، ایمان ہی کا درجہ ہے۔

آسمانوں اور زمین کے تمام سفر سوالات کے سفر ہیں لیکن دل کا سفر جواب کا سفر ہے ان سوالات کے جوابات دانش وروں سے نہ پوچھیں، اپنے دل سے پوچھیں۔ اس دل سے، جو گداز ہونے کا دعویٰ بھی رکھتا ہے!!



## ہم کیا ہیں؟

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ شاید نہ کہہ سکوں۔ اور جو کچھ کہہ رہا ہوں شاید وہ میرے مقصد ہی نہ ہو۔ یہی تو مجبوری ہے اور یہی میرے عہد کی پہچان ہے۔ ہم ایک کرب ناک صورتِ حالات سے گزر رہے ہیں۔ انسان اپنے اصل سے کٹ چکے ہیں اور ان کا اپنے معنی سے ہٹ چکے ہیں ہم لوگ الگ الگ جماعت ہیں اور یوں وحدتِ قوم جمعیتِ انفریق بن کر رہ گئی ہے۔

ہم مصروف ہیں لیکن ہماری مصروفیت بے معنی ہے۔ ہم دفتروں میں کچھ اور ہیں اور گھروں میں کچھ اور۔ ہم وطن کی تعمیر کی بجائے اپنے مکانوں اور آستانوں کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہمارا اصل وطن ہماری خواہشات کا نام ہے۔ ہم اپنی پٹی اناؤں میں رہ رہے ہیں۔ ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہمارے علم نے ہمیں دوسروں پر فوقیت جتانا ہی سکھایا ہے۔ دوسروں کے کام آنا نہیں۔ ہم اپنی نگاہ میں خود ہی سب کچھ ہیں۔ ہم کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ ہم خود بھی قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔

خواب دیکھنا ہمارا مشغلہ ہے۔ ہم عظیم مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ پہلے بھی ہم ایک خواب کی پروڈکشن ہیں۔ ایسا خواب جو ابھی تک اپنی تعبیر کی تلاش میں ہے۔ مستقبل کا تصور ہمیں حال سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ ہم اپنے پیچھے ٹی ایسے چھوڑ آئے ہیں لیکن ہم ہر حالت سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ ہم صرف انسانوں سے سمجھوتہ نہیں کرتے۔ ہم اصول بیان کرنے والی قوم ہیں۔ دوسروں کو اصول کی تعلیم دیتے ہیں، معصم کے بے عمل ضروری نہیں۔ ہم حقیقت بیان کرتے ہیں اور سننے والے سے آگے بیان کرتے ہیں اور اس طرح بیان جاری رہتا ہے اور عمل کی فرصت ہی

نہیں ملتی۔

ہمارا نظام فکر امپورٹ ہوتا ہے اور اس طرح ہماری وابستگی الگ الگ ہے۔ ہم میں سے کو کچھ لوگ روس نواز ہیں۔ کچھ لوگ امریکہ نواز ہیں۔ کچھ لوگ چین نواز، ہند نواز اور کچھ لوگ ”حق نواز“۔ ہم پر ثقافتوں اور سیاستوں کی یلغار ہے۔ ہماری پسندیدہ یا تر، ہند یا تر ہے۔

ہمارے پیسے وی سی آر کی بھرمار ہے۔ خدا کی مار ہے کہ ہر چوتھا آدمی ہیروئن کا شکار ہے۔ بس استغفار ہے۔ ہم خوابوں میں بلند پرواز ہیں۔ یہ لگ بات کہ ہمارے گردوارہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

یہ قوم غریب ہے لیکن لوگ امیر ہیں۔ کاریں ہی کاریں، راہ چلنا دشوار ہے۔ مہنگائی حد سے زیادہ اور خریداری بھی حد سے زیادہ، عجب عالم ہے۔ خطرات بیان ہو رہے ہیں لیکن کسی پر کوئی اثر نہیں۔ بیان کرنے والے بھی اپنے عالی شان مکانوں کی تعمیر کرتے جا رہے ہیں، جہاں الفاظ اپنے مفاد میں بدل چکے ہوں وہاں اپنے عہد کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ ہمارا عہد عجب عہد ہے۔ اس میں کیا نہیں ہو رہا۔ دور تضادات کا دور ہے۔ انسان کے باہر تضاد، خود انسان ہی مجموعہ تضاد ہے۔ آج کا انسان ہمہ وقت مصروف ہے۔ اس کے پاس فرصت نہیں۔ وہ دوڑتا جا رہا ہے۔ اس کو کسی نے ایک نامعلوم منزل کی طرف گمنام سفر پر مصروف کر رکھا ہے۔ وہ سب کچھ جاننے کا دعویٰ رکھتا ہے اور دعوے کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا کہ یہی اس کی جہالت کا ثبوت ہے۔

ہمارا عہد تعمیر و تخریب کا مظہر ہے۔ نئے ادارے، نئے امکانات، نئے

ماڈل، نئے آستے ابھر رہے ہیں اور پرانے اور مانوس ادارے ختم ہو رہے ہیں۔ پرانے عیسے ہٹائے جا رہے ہیں اور نئے شاہکار بنائے جا رہے ہیں۔ یہ دور قدیم تہذیبی اداروں کے خاتمے کا دور ہے۔ کل کا انسان عقیدتوں کا مظہر تھا لیکن آج کا انسان ہر عقیدت اور ہر عقیدے سے آزاد ہے۔ آج کا عقیدہ بے عقیدہ ہے۔ آج صرف ایک انسان کی پرستش کی جاتی ہے۔ یعنی اپنا آپ ہم اپنی امانت کے پجاری ہیں۔ ہم اپنی انہی خواہشات کے آگے سجدہ ریز ہیں۔ ہم اپنے علاوہ کسی کو اہم نہیں سمجھتے۔ آج کے ماحول میں خود پسندی ہی پسندیدہ عمل ہے۔ انسان آئینہ دیکھتا رہتا ہے۔ وہ نہ آئینے میں اترتا ہے نہ اس سے باہر نکلتا ہے۔ ہر شے میں مداخلت ہے۔ کھانے میں، پینے میں، سوچنے میں، عبادت میں، مذہب میں، مدرسے میں، خانقاہوں میں، سیاست میں، صحافت میں، دوا میں، دعا میں، وف میں غرضیکہ ہر اد میں مداخلت ہی مداخلت ہے۔ جو ہے وہ نہیں ہے۔ ہم وہ نہیں جو ہم نظر آتے ہیں۔ ہمارا وجود اصل وجود سے مختلف ہے۔ ہمارے افکار خالص نہیں، ہماری سوچ صحت مند نہیں، ہمارے چارہ گر چارہ گر کا لفظ بے معنی ہے۔ ہمارے قائد آج بھی صرف قائد اعظم ہی ہیں۔ اگر قائد اعظم زندہ ہو جائیں تو قائدین کی کثیر تعداد مر جائے، ہمارے ہاں کوئی شے بھی تو ایسی نہیں جو بھروسے کے قابل ہو۔ ہم محسن فراموش قوم ہیں۔ اگر آج اقبال زندہ ہو جائے تو قوم کے حالات دیکھ کر صدمے سے پھر مر جائے۔ یہ قوم عجب قوم ہے۔ اسے اپنے حال سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ ماضی کے بزرگوں کی یادیں مناتی ہے اور مستقبل کے لیے کوئی کام نہیں کرتی۔ یہ بے حسی کا شکار ہے۔ پاؤں تلے سے زمین نکالا چاہتی ہے۔ سر پر آسمان گرا چاہتا ہے۔ یہ بی بی رنی ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ اسے جمہوریت کا انتظار ہے کہ ہر بد کو جمہوریت سے مٹا جائے گا۔ مدتیں گزر گئیں اور ابھی تک یہ فیصلہ کرنا باقی ہے کہ اس

ملک کا نظم حکومت کیا ہوگا!! نظام تعلیم کیا ہوگا۔ نظام معیشت کیا ہوگا۔ نظم عقیدہ کیا ہوگا۔ اسدم ہوگا تو کون سا ہوگا۔ فقہ کون سی ہوگی زبان کیا ہوگی قومی لباس کون لوگ کب پہنا کریں گے۔ صحافت کس نہج پر استوار ہوگی اور سیاست کا دائرہ کیا ہوگا۔ اس ملک میں مقبول ترین بیانات وہ ہیں جن کا، گے، گی ہو۔ ہر چیز ہوگی، سب کچھ ہوگا۔ سب انتظامات کر لیے جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کی بگڑی بن جائے گی۔ سب بادل چھٹ جائیں گے۔ سب کچھ یہیں رہے گا۔ افسوس ہم نہ ہوں گے۔

چارہ گروں کے لیے نوید ہے کہ مریض زیادہ دیر ان پر بوجھ نہ ڈالے گا۔ چاروں صوبے چاروں عناصر کی طرح ابھی ظہور ترتیب میں ہیں۔ منتشر ہونے کا اندیشہ خاتمہ بدہن بعید از قیاس بھی نہیں۔ ابھی جمہوریت نے گل کھدنے ہیں ابھی اور بھی شکوے نے پھوٹیں گے۔ ہم سب کرنیں ہیں جو اپنے سورج کو مسلسل چاٹ رہی ہیں۔ یہ سورج ابھی اللہ کے فضل سے قائم ہے۔ لیکن ہمارا عمل بد اعمدی کے سوا کیا ہے۔ ہم نے غور کرنا چھوڑ دیا ہم مستغل انتظار میں ہیں کوئی آئے گا، جگائے گا۔ ہم سے کام لے گا ہم عظیم قوم بن جائیں گے لیکن ابھی نہیں شاید

ابھی اس دم نے نافذ ہونا ہے۔ مسلمانوں پر اسلام نافذ ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے یا تو مسلمان وہ نہیں رہے یا اسلام وہ نہیں جو دلوں پر پہلے دن سے نافذ ہو جاتا تھا۔ یا اللہ ہم کہاں سے چلے تھے کہاں آگئے۔ میرے مولد ہمیں جگا لیکن نہیں خدا جگائے گا تو جھکے سے آنکھ کھلے گی جس کو احساس نہ جگائے اسے کون جگا سکتا ہے۔ میرے مولا ہماری بے حسی کو بے حیائی نہ بننے دے۔ میرے آقا ہم نا اہل ضرور ہیں، لیکن تیرے حبیبؐ کے نام لیوا ہیں۔ ہم پر رحم فرما، ہمیں









ہر نانِ قبت اندیش کو زعم آگئی ہے، ہر چہ زبانِ سیاست دان ہے۔ ہر آدمی ہر دوسرے آدمی کو ہر وقت کچھ نہ کچھ سمجھا رہا ہے۔ سیاست کے فلسفے بیان ہو رہے ہیں۔ جمہوریت کے فوائد پر ٹیکچر ہو رہے ہیں۔

کالعدم کو سوائے عدم ہی کیوں نہ رخصت کر دیا جائے؟ آج کی سیاست راستے مانگ رہی ہے۔ بھیک مانگ رہی ہے۔ رحم طلب کیا جا رہا ہے۔ التجا ہمارا پسندیدہ عمل ہے۔

علم والے آدمی ملک کو آدمی ملک کے خلاف اکسارہے ہیں۔ اسام دنیا کو نظام دینے کے لیے آیا اور آج ہمیں لادین اور بے دین نظام کی افادیت بتائی جا رہی ہے۔ نئی معیشت نئی سیاست کی اساس ہے۔ شکر ہے کہ ابھی سیاسی ڈھانچے بننے باقی ہیں۔ ابھی اتنی جلدی ہی کیا ہے! مارک ٹائم ہمارا نعرہ ہے۔ اک عجب عالم ہے قیمت ہے کہ رات کب کی ختم ہو چکی ہے لیکن سورج ابھی نہیں نکلا ابھی شاید طویل منصوبہ بندی کا دور ہے۔ سوال یہ ہے کہ صرف بندی کا زمانہ کب آئے گا۔

عزیزانِ محترم! میری مانو تو آپ کسی کی نہ مانو کسی کہ نہ سنو۔ اپنی مرضی کرتے جاؤ۔ حتیٰ کہ وہ وقت آن پہنچے جب ساری قوم اللہ کی رحمت کو پکارنے پر مجبور ہو جائے اور پھر افلاک سے نالوں کا جواب آئے گا۔ دعا کو تاثیر کا منہ دیکھنا نصیب ہوگا۔ ایمان سینوں میں بیدار ہوگا اور پھر نکلیں گے عاروں سے طاقور شیر، اللہ والے، باطن کے شہباز، سلطان الفقراء، شہنشاہ قلندراں اور پھر آناؤں ناطون کے رخ موڑ دیئے جائیں گے، ٹوٹے ہوئے شیشے معاف کرنا ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیئے جائیں گے۔ حق والوں کو حق مل جائے گا قوم کے روشن مستقبل کا ستارہ طلوع

تکر بکر، قلم و داف

داف ملی داف

ہوگا، اندیشے دم توڑ دیں گے اور امید کے مسکن جگمگائیں گے۔ لیکن کیا کبھی ایسے  
ہوا۔ کیا ایسے ہو سکتا ہے اہل باطن کی خدمت میں سوال ہے!



## عذاب

عذاب اور عبرت کے الفاظ سننے میں بھی سخت ہیں اور سمجھنے میں بھی۔ عذاب کسے کہتے ہیں عذاب اس وقت کا نام ہے جب انسان اپنے عمل کا نتیجہ اپنے سامنے دیکھے۔ انسان کی بد اعمالیاں جب ایک خوفناک نتیجہ بن کر اس کی راہ میں آمو جو ہوں، عذاب کا لمحہ ہے۔

فطرت انسان کی لغزشوں اور بد اعمالیوں کو اکثر معاف کرتی ہے۔ انسان اپنے اعتقادات کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ سرکشی کرتا ہے، وہ لاف زنی کرتا ہے۔ وہ خود کو خود بخیر، مالک و مختار سمجھتا ہے، وہ اطاعت سے روگردانی کرتا ہے اور اگر اطاعت کرے بھی، تو اس کا معاوضہ اس شکل میں وصول کرتا ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں۔ فطرت خاموش رہتی ہے۔ سرکشی جاری رہتی ہے اور پھر ایک ایسا حد آتا ہے کہ ظالم کا ہاتھ معصوم کی طرف اٹھتا ہے۔ مجبور پر اٹھتا ہے۔ مظلوم کی فریاد فطرت کو انصاف کے لیے پکارتی ہے، بس فطرت جب انصاف کرنے پر آ جائے تو سمجھ بیٹھے کہ عذاب کا وقت آ گیا۔ کسی انسان کے کون سے اعمال کسی انصاف کے کیسے منظر ہو سکتے ہیں۔ انصاف، بس قیامت ہے، عدالت رحم نہیں کرتی۔ جب رحم نہ رہے تو اعمال کا نتیجہ سوائے عذاب کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

عذاب کے لمحات، محاسبے کے لمحات ہیں، عبرت کی گھڑیاں ہیں قیامت کا منظر ہے۔

عذاب کا وقت وہ وقت ہے جب انسان سے دعائیں چھن جائیں جب انسان گتھیوں کو اپنی عقل سے سلجھانا چاہے اور عقل سے وہ گتھیاں مزید الجھ

جائیں تو سمجھ جائے کہ عذاب قریب ہے۔ عقل اور صرف عقل، طاقت اور صرف طاقت مسائل کا حل نہیں دے سکتے۔ جب تک اس کا فضل حاصل نہ ہو، ہمارے تمام کام اور ہمارا تمام حاصل، ہمارے لیے عذاب لکھ رہے ہیں ہم خود اپنے لیے اپنے ہاتھوں سے عذاب لکھتے ہیں۔

یتیم کا مال کھانے والا کتنی خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ اسے کوئی روک نہیں  
سکتا۔ مال کا مالک یتیم ہے، محروم ہے اور غاصب اپنی قوت میں ہے۔ وہ یتیم کا  
مال ہڑپ کر جاتا ہے، بس یہاں سے یہ عذاب کی ابتداء ہوتی ہے۔ یتیم کا مال، یتیم  
کا حق، یتیم کا حصہ پیٹ میں جائے تو ایسے ہے جیسے پیٹ میں آگ اور عذاب  
کسے کہتے ہیں۔ جب انسان کا لالچ، اس کی عقل، اسے سمجھنے پر مجبور کر  
دے۔ عذاب کو ہم خود ہی دعوت دیتے ہیں۔ ہوس زر پرستی ابتداءئے عذاب ہے۔

جب انسان کے دل سے انسانوں کا احترام اٹھ جائے تو سمجھ بیچے کہ عذاب کا دور آگیا۔ عذاب کے زمانے بد اعتمادی اور بدنظمی کے زمانے ہیں۔ جب انسان دوستی، انسان دشمنی میں تہدیل ہو جائے تو آغاز عذاب ہے۔ انسان جب انسانوں کو خوفزدہ کرے یا ان سے خوفزدہ رہے تو اور عذاب کیا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ ہر انسان ہر دوسرے انسان کو بری نگاہ سے دیکھے اور افسوس تو یہ ہے کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہو ہر طرف قتل و قاتل ہو اور حال یہ ہو کہ بس برا حال ہو ہر طرف مسیحاؤں کا جھوم ہو اور مریض دم توڑ رہا ہو خدا خونی نہ رہے، تو مخلوق خونی کی وبا پھیل جاتی ہے۔ اور عذاب کی انتہائی صورت یہ ہے کہ عذاب نازل ہو رہا ہو اور لوگ بد مستیوں اور رنگ رلیوں میں محو ہوں پانی سر تک آنے وال ہو اور انسان ٹس سے مس نہ ہو۔

عذاب کے زمانے ہر دور میں مختلف انداز سے آتے ہیں۔ جب اول و ماں باپ سے باغی ہو اور ماں باپ اولاد سے بے خبر ہوں تو کسی مزید عذاب کا کیا تذکرہ؟

آج کے انسان کے لیے آج کا عذاب ہے آج کی بد اعمالیاں آج کی سزا کی منتظر ہیں جب انسان کے پاس آسائشیں ہوں اور سکون نہ ہو تو عذاب ہے جب محظوظ ہو دو ہوں اور حفاظت غنقا ہو تو عذاب ہے جب نیکی بدی نظر آئے اور بدی محترم مانی جائے تو عذاب ہے عذاب کا وقت خدا کسی پر نہ لائے وہ وقت کہ جب مسلسل سفر ہو رہا ہو اور فاصلے نہ کٹتے ہوں تو عذاب قریب ہوتا ہے۔ ایسا وقت کہ انسان پر بغیر قصور اور بغیر کسی جرم کے مصیبتیں نازل ہوں اور وہ فریاد نہ کر سکے، عذاب کا وقت ہے۔ عذاب اس وقت کو بھی کہتے ہیں کہ تبلیغ کرے اور سامعین مذاق اڑائیں۔ جب محسن کشی و ہا کی شکل اختیار کر لے، عذاب ہے۔

عذاب کا لمحہ وہ لمحہ ہے جب کرنیں اپنے سورج کو چاٹنے لگ جائیں۔ جب شاخیں اپنے درخت کو کھا جائیں۔ جب اعضاء اپنے وجود سے کٹ جانا چاہیں، جب اجزاء اپنے کل سے منحرف ہوں، جب اپنی صورت نہ رہے، جب نہ ہونا ہونے سے بہتر ہو، جب آدھا راستہ طے کرنے کے بعد مسافر سوچنے لگ جائیں کہ یہ سفر بے کار ہے عذاب ہی عذاب ہے۔ اس مسافر کے لیے جس کے لیے اپنے سفر میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہے۔ آگے جانے کی خواہش نہ رہے اور ٹوٹ جانا ناممکن ہو جب انسان اپنے ماضی سے کٹ جائے اور مستقبل واضح نہ ہو، قافلے منتشر ہو جاتے ہیں اور رہنماؤں کی کثرت ہوتی ہے، عذاب ہے ایسی

مسافرت جس میں سفر کا انجام بھی سفر ہو جس میں ہم سفر صرف اندیشہ ہو  
ایسا سفر جیسے صحرا میں رات کی تنہائی میں ایک مسافر، جسے اپنی آواز سے ڈر لگتا ہے۔  
ہولناک سنائے میں چیخ کی آواز، عذاب کا اعلان ہے۔

جب انسان اپنے دلیں میں خود کو پردیسی محسوس کرے تو عذاب ہے۔ جب  
اپنے گھر میں انسان خود کو مہمان محسوس کرے تو عذاب سے کم نہیں۔ جب آوازوں کا  
اتنا شور ہو کہ انسان کی گویائی آواز کے سمندر میں ڈوب جائے تو دکھ کا زمانہ ہے۔  
جب سورج روشنی دینا بند کر دے تو عذاب ہے۔ جب زمانہ امن کا ہو اور حالات  
جنگ سے ہوں تو عذاب ہے۔

طرفہ عذاب تو یہ ہے کہ دلوں سے مروت نکل جائے، احساس ختم ہو جائے،  
ہمدردی کے جذبات سرد پڑ جائیں اور انسان کھوکھلی آنکھوں سے جلتے ہوئے گھر اور  
ڈوبتے ہوئے سہارے دیکھ رہا ہو جب فریاد زبان پر آنے سے پہلے زبان کٹ  
جائے جب انسان کے پاس راز ہو اور اس کا کوئی محرم راز نہ ہو، جب آنکھوں میں  
آنسو ہوں اور اس کے گرد جشن منانے والے درندے ہوں جب وحشت رقص  
کرے اور معصومیت کے جنازے اٹھ رہے ہوں عذاب ہے۔ میرا روئے سخن  
خدا نخواستہ کراچی کی طرف نہیں قطعاً نہیں، کیونکہ کراچی جس عذاب سے گزرا  
ہے اس کے لیے کوئی بیان ممکن نہیں وہاں جو ہونا قابل بیان ہے وہ عذاب  
تھا، عتاب تھا، قیامت تھی کہ کیا تھا اتنے مہذب زمانے میں، اتنے بڑے شہر  
میں، اتنے غیر مہذب واقعات جس نے سنا اسے اپنی سماعت عذاب لگی، جس  
نے دیکھا اسے اپنی بھارت عذاب نظر آئی ایسے واقعات سننے سے بہتر تھا کہ ہم  
بہرے ہو جاتے، ایسے واقعات دیکھنے سے بہتر تھا کہ ہم اندھے ہو جاتے، اشرف





قطر قطر، قطر قطر  
واصف علي واصف

وہ صوفی علی و صوفی

فضل کے حوالے رکھ کر کیا یہ ممکن نہیں کہ جس قوم سے خطا ہو جائے، اس پر بھی تیری عطا ہو جائے ہو تو سکتا ہے تو اگر چاہے تو رات سے دن پیدا ہو، مردہ سے زندہ پیدا ہو، خزاؤں سے بہار پیدا ہو نفرت سے محبت پیدا ہو تو چاہے تو مدھم روشن ہو جائے ہمارے مالک ہم پر اپنی رحمت کے دروازے کھول، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں عذاب سے بچا!!

## مصروفیت

ہم سب مصروف ہیں۔ ہمارے پاس فرصت نہیں۔ ہم کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اچھائی نہ ہو تو برائی کرتے ہیں۔ ہم خاموش اور تنہا ہوں، تو بھی کچھ نہ کچھ نہ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی یادیں دہراتے ہیں، کبھی مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ تصورات کے ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں۔ ہم آئینوں میں عکس دیکھنے کے نادی ہیں۔ حقائق کو دیکھنا اتنا دلچسپ نہیں، جتنا حقائق کا عکس۔

مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ کسی کے پاس کسی کے لیے وقت نہیں ہیں۔ اپنے لیے وقت میسر نہیں آتا۔ ہم مصروف ہیں۔ ہمارے لیے ہماری مصروفیت ہی ہماری خود گریزی، خود فریبی، خود شکنی اور خود فراموشی کا جواز مہیا کرتی ہے۔ ہم ایک کام کرتے ہیں تو دوسرا بھول جاتے ہیں۔ ہمارے پاس بہت سے مقاصد ہیں بڑے منصوبے ہیں۔ طویل پروگرام ہیں۔ کثیر ارادے ہیں، بے شمار عزائم ہیں۔ بس ہر شے کی کثرت ہے، صرف وقت کی قلت ہے۔ زندگی مختصر ہے اور مصروفیت بے اندازہ۔ ہم کیا کریں۔ ہم سوچتے ہیں تو ندامت ہوتی ہے، اس لیے ہم سوچنے کی بجائے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

ہم لوگوں سے آشنائی کرتے ہیں۔ ہر ایک سے دوستی، ہر ایک سے رابطہ اور نتیجہ یہ کہ ہم سب کو مایوس کرتے ہیں۔ ہم خود بھی مایوس ہو جاتے ہیں، ہم اپنے روبرو نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ ہم اپنے آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ہم نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ اب ہم مشین کا پرزہ بن چکے ہیں۔ بس فنانٹ، کھٹ کھٹ چل رہے ہیں۔ کیوں اور کہاں؟ یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس وقت

نہیں۔

اتنا تو معلوم ہے کہ ہم جلدی میں ہیں ہمیں کس بات کی جلدی ہے، یہ معلوم نہیں۔

ہم صبح گھر سے نکلتے ہیں، خوشی خوشی، جلدی جلدی ایسے جیسے کوئی مجرم طویل قید سے اچانک رہا ہو جائے ہم دفتروں، کارخانوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں جاتے ہیں اور کام شروع کر دیتے ہیں، مصروف ہو جاتے ہیں اور پھر شام کو گھر کی طرف ایسے بھاگتے ہیں جیسے کوئی پیاسا کنویں کی طرف ہم گھر پہنچتے ہی اور قسم کی مصروفیات میں کھو جاتے ہیں ہم مصروف رہتے ہیں حتیٰ کہ نیند کی آغوش میں سب مصروفیتوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔

کائنات کا ذرہ ذرہ مصروف ہے چمچ، پرند، جمادات، نباتات، سب مصروف ہیں اور ہم تو افضل ترین ہیں، ہم کیوں نہ مصروف ہوں؟ ہم مصروف تو رہیں گے لیکن غور طلب بات صرف یہ ہے کہ ہم اپنی مصروفیات سے کیا حاصل کرتے ہیں۔؟

ہم مصروفیت کو کمائی بناتے ہیں اور پھر اس کمائی کے استعمال کے لیے الگ مصروف ہوتے ہیں زندگی مصروفیت میں گزر جاتی ہے اور پھر اچانک اس حقیقت کا کشاف ہوتا ہے کہ اگر مرنا ہی تھا تو مر مر کے جینا کیوں تھا۔! کتنے ناپ تول کے قدم رکھے تھے، کتنی احتیاط کی تھی، کیسے کیسے جتن کیے تھے اور فرصت کے چند محلات نہ ملے اور جب ملنے لگے تو موت نے مہلت نہ دی پہلے زندگی مہلت نہیں دیتی اور پھر موت آڑے آ جاتی ہے کیا ہمارا مقدر صرف مصروف

رہنا ہی ہے؟ کیا ہم کبھی آزاد نہیں ہو سکتے؟ کیا ہمارے پاس اس خوبصورت کائنات کا دیکھنے کے لیے وقت نہیں ہوگا؟ کیا ہم ٹکلتے اور ڈوبتے سورج کی مناظر کبھی نہیں دیکھ سکیں گے؟ کیا چاند رات اور چاندنی رات ہمارے لیے نہیں ہیں؟ کیا ہم تاریک مصروفیت کی اس رات میں بھٹکتے رہیں گے؟

کیا انسان افضل تخلیق نہیں؟ انسان پھاڑوں کی خوبصورت چوٹیاں اور وسیع و عریض میدانوں سے کب لطف اندوز ہوگا؟ جب تک انسان مصروفیت کے عقوبت خانے سے آزاد نہ ہو جائے، اسے زندگی کا حسن نظر نہیں آسکتا۔ زندگی، شکم پروری ہی تو نہیں۔ تسکین قلب و نظر کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ فطرت کا حسن، فطر کائنات کی منشا کے مطابق دیکھا جائے۔ آنکھیں عطا کرنے والے نے آنکھوں کے لیے نغروں کا اہتمام کیا ہے، کانوں کے لیے گلستانِ مستی میں لغزات کے جشے بہہ رہے ہیں، غور و فکر کے لیے رزہائے سربستہ منتظر ہیں، روح کے لیے ماندہ تجلیات بچھا ہے ہم سمجھتے نہیں ہم صرف آسائش و جود کے لیے مصروف ہیں ہم گنتے ہیں، حاصل کرتے ہیں اور خرچ کرتے رہتے ہیں۔ ہماری زندگی اعلیٰ تقاضوں سے محروم ہے، ہماری مصروفیت صرف شہرت، مال اور لذت و جود کے لیے ہے کیا زندگی کے لیے اور کوئی ضرورت نہیں؟ کیا زندگی کمانے، کھانے، پہننے اور سونے کے علاوہ کچھ نہیں؟ کیا زندگی کے نصیب میں فرصت نہیں؟ کیا ہمارے پاس کسی کے آنسو پونچھنے کا بھی وقت نہیں؟ ہم ہر انسان کو اپنی ضرورت اور اس کی اقداریت کے حوالے سے جانتے ہیں کیا انسان، انسان کو صرف انسانیت کے حوالے سے کبھی نہیں پہچانے گا؟ کیا ہمارے مرتبے اپنے ماتحتوں کو ہمیشہ نفرت سے ہی دیکھیں گے؟ کیا ڈاکٹر مریضوں کی جیب سے باہر نہیں نکل سکیں گے؟ کیا

ہماری مصروفیت ہمیں دوسروں کے لیے تلواریں بنائے رکھے گی؟ کیا ہم دوسروں کے لیے کبھی شربت نہیں بنیں گے؟ کیا ہماری مصروفیت نفرت اور تلخی سے آزاد نہ ہوگی؟ وہ کون لوگ تھے جو خود پیاس سے مر جاتے تھے اور پانی اپنے دوسرے پیاسے بھائی کو دے جاتے تھے کیا وہ لوگ تھے بھی یہ ہمارا وہم ہے؟ کیا ہماری مصروفیت کسی بانیصیب کاہل کو معاف نہیں کر سکتی؟ کیا کاہل بانیصیب ہو سکتا ہے؟ کیوں نہیں۔ بانیصیب کی اپنی مصروفیات ہیں دل کی مصروفیت، نگاہ کی مصروفیت، روح کی مصروفیت، زندگی کے راز پانے والے، سراغ حیات دریافت کرنے والے دفاتر، کارخانوں، کھیتوں اور کھلیاؤں میں مصروف نہیں ہوتے وہ صرف آشنائی کے رموز کی گرہ کشائی میں مصروف ہوتے ہیں ان کی نگاہوں میں کچھ اور ہی جلوے ہوتے ہیں وہ کچھ نہیں کرتے ان کے کام ان کے کیا کام۔ ان کا صرف ایک کام ہے دُورے کے دل کی دھڑکنیں سننا اور کتب ہستی کی ورق گردانیاں کرنا۔ وہ خود کسی فنکار کا لوکھ کام ہیں ان کا اپنا کیا کام!! وہ خود کسی کے ہیں، ان کا اپنا کیا پوچھنا، ان لوگوں کی فرصت زمانے والوں کی مصروفیت سے ہزار درجے بہتر یہی لوگ زمانے کا مستقبل ہوتے ہیں یہ انسانوں کے افق ذہن پر تابناک سورج کی طرح طلوع ہوتے ہیں اور ان کی بے مصرف مصروفیت کی تیرہ شعلے کی دجیاں اڑا دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں، افکار کے چہرے سے پردہ اٹھانے والے۔ ان لوگوں کو فرصت کا راز مل چکا ہے، ان کے ہاں کوئی مصروفیت نہیں اور یہ لوگ ہی صحیح مصروفیت کے مفہوم سے آشنا ہیں

جو شے چنے سے حاصل نہیں ہوتی وہ ٹھہرنے سے حاصل ہو جاتی ہے



جو راز پیسے جمع کرنے میں نہ پایا جائے، وہ خرچ کرنے میں پایا جائے گا۔ جسے سونے  
و ل دریافت نہ کر سکے، اسے جاگنے والا ضرورت دریافت کر لے گا۔ انسان کے  
گرد مصروفیت نے جو جال بن رکھا ہے، اسے فرصت توڑ دیتی ہے۔ مصروفیت،  
غلامی ہے اور فرصت، آزادی۔ اس سے پہلے کہ ہم سے سب کچھ چھن جائے، ہم  
خود ہی کیوں نہیں چھوڑ دیتے!!

## منفعت

منفعت طبی یا افادیت پرستی یا سادہ الفاظ میں فائدے کی منہا خود غرضی کا سفر بڑا ہی بے رونق اور بے کیف سا سفر ہے۔ انسان ہر حال میں اگر صرف یہی سوچتا رہے کہ اس کا ذمہ کس بات میں ہے تو وہ کائنات سے کٹ کر رہ جائے گا۔ ہر بات تو انسان کی منفعت کے لیے نہیں۔ یہ کائنات دوسروں کی منفعت کی بھی کائنات ہے۔

اپنا ذمہ سوچنے والا انسان دوسروں کو صرف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی کو کچھ ذمہ پہنچانا نہیں چاہتا اور اس طرح وہ فیض ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسان دوسروں کے کام نہ آئے، تو ان سے کام لینا قلم ہے۔ یہ قلم دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر صاحب مقام اور صاحب مرتبہ انسان اپنے مقام اور اپنے مرتبے کا خراج وصول کرتا ہے اور کچھ نہیں تو لوگوں سے سلام کی توقع کرتا ہے، لیکن خود لوگوں کو سدا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

معاشرے میں عزت کی تمنا خود غرضی کی اہتا ہے، اس طرز سوک کو استحصال بھی کہتے ہیں۔

آخر دوسرے میں باعزت ہونے کی تمنا ہی کیوں ہو۔ لوگوں سے اپنی صداقت اور دیانت کی قیمت کیوں وصول کی جائے۔ لوگوں کو کیوں مجبور کیا جائے کہ وہ آپ کی عزت کریں، آپ کا احترام کریں، آپ کا ذکر کریں، آپ کی بات کریں۔ لوگ اپنے اپنے کام کیوں نہ کریں۔

ایک آدمی محنت کرتا ہے۔ نوکر ہو جاتا ہے۔ افسر بن جاتا ہے۔ اب افسری کر کے ماتحتوں سے خراج وصول کرتا ہے۔ ان سے توقع کرتا ہے کہ وہ اس کی عزت کریں، اس کو سدھم کریں۔ اس کی غیر سرکاری حیثیت کا بھی احترام کریں، جبکہ وہ خود ان کی زندگی اور زندگی کے تقاضوں سے بے خبر اور لاتعلق ہو۔ شاید لوگ مرتبہ اس سے چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ مرتبے کے آگے سرنگوں ہوں۔ کیا پنی سر بندی دوسروں کو سرنگوں کرنے سے حاصل ہوتی ہے؟

شاید انسان نے فطرت سے یہ مزاج حاصل کیا ہے۔ ایک وسیع کائنات بنانے والے نے انسان کے لیے ایک محدود دنیا بنائی اور اس میں انسان کو محدود زندگی دے کر محدود استعداد عطا فرمائی۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ اب اس محدود انسان پر لازم ہے کہ محدود کائنات بنانے والے کا سجدہ کرے۔ اس کے کسی فعل پر تنقید نہ کرے۔ اس کا گلہ نہ کرے۔ بس اس کی تسبیح کرتا جائے۔ انسان کی مجبوری یہی ہے کہ وہ اس کے علاوہ کربھی کیا سستا ہے۔ انسان کو جکڑ کر رکھ دیا گیا۔ اس کی تھدیر قوی ہے اور تدبیر کمزور۔ وہ کرے بھی تو کیا کرے۔ بے بسی میں سجدے کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔

انسان سوچتا ہے۔ اسے سوچنا نہیں چاہیے، لیکن وہ سوچنے پر بھی تو مجبور ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اتنے بڑے ستارے، اتنے بڑے سیارے، یہ چاند، یہ سورج آخر کس کام کے۔ شبِ فرقت یا تنہائی کی رات میں تارے بڑے کام آتے ہیں۔ اواس نسان ستارے گننا رہتا ہے اور ستارے گنتی میں نہیں آتے۔ آخر ان ستاروں کا فائدہ کیا ہے؟

اتنے بے شمار ستارے، پیارا انسان کی راتوں کے ساتھی اس کی بیماری دور

نہیں کرتے۔ غریب کی غریب دور نہیں ہوتی۔ وہ ستارے گنتا ہے اور اس کی اپنی آنکھوں سے تارے گرتے ہیں، بلکہ انکارے گرتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ یہ سب کیا ہے؟ اتنا بڑا سورج، روشنی کا سفیر، زندگی کا محور کتنا منور ہے۔ سورج خود روشن ہے، لیکن کسی انسان کے، مجبور انسان کے، غریب انسان کے دینے کو چوبھرتیل تو نہیں دیتا۔ آخر اس کا کیا فائدہ؟

بادل برستے ہیں، گر جتے ہیں، کڑکتے ہیں۔ دبدبہ ہی تو ہے۔ قطرے قطرے کپڑے سے، لے ترستے رہتے ہیں۔ بادلوں کا فائدہ کیا ہے۔ شعراء نے بادلوں سے مضامین لکھے ہوں گے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو شعراء کا کیا فائدہ ہے۔ شعراء موزوں کرنے والے زندگی کو موزوں نہیں کر پاتے۔ شعراء کی صورت دیکھنے والے شعراء کی صورت نہیں دیکھ سکتے۔ آخر اس کا فائدہ ہی کیا ہے؟

پہاڑوں کا سلسلہ وسیع و عریض ہے۔ پہاڑ راستوں کی دیوار بنے ہوتے ہیں، ورنہ ایک ملک دوسرے ممالک کے ساتھ ہی ملا ہوتا۔ کتنے فائدے ہیں پہاڑوں کے۔ ان سے کیا نہیں ملتا۔ ان پر مفت آگے والے درخت ہیں۔ جن سے لکڑی ملتی ہے۔ پھل دار درخت ہیں۔ ان سے پھل ملتا ہے اور جو بہت ہی بے مقصد پہاڑ ہیں۔ ان سے کرش ملتا ہے لیکن کہاں ملتا ہے؟ لکڑی غریب کے خون سے زیادہ مہنگی ہے۔ پھل بیمار کی قوت خرید سے باہر ہے اور رہا کرش۔ خرید کے دیکھو۔ اتنی عظیم طاقت، پہاڑ کس کے لیے؟

بنائے والے نے دریا بنائے۔ نہریں اور ڈیم اور پانی حاصل ہوا۔ بجلی بنی گئی اور ایک عام انسان کو کیا ملا؟ بجلی سے کارخانے چلے۔ نہروں سے فصل حاصل ہوئی۔ کس کے لیے؟ ملک امیر ہو گئے۔ انسان غریب رہے۔ تقسیم نامنصفانہ رہی۔

دریا خشک ہو جائیں، تو سب برابر ہو جائیں۔ طغیانی آئے تو سب برابر۔ ورنہ کیا فائدہ؟

صرف یہی نہیں۔ ہر سطح، ہر شعبے میں نعمتیں محروم انسانوں کے بے عجب حال پیدا کرتی ہیں، یعنی وہی برا حال۔ صاحبانِ اصف ہی کو لیں۔ سوئے ادب مقصود نہیں۔ عالی مرتبت صاحبانِ کشف و کرامت معتقدین کو کیا دیتے ہیں؟ حس محرومی! کسی کے عرفان کا کیا فائدہ؟ کوئی صاحبِ کمال ہو، تو ہو کرے۔ ہماری آرزو تو پوری کرے، ورنہ کیا فائدہ؟ ہمارے دکھ کی دوا نہ کرے، تو ابنِ مریم ہوا کرے کوئی۔ ہمیں کیا فائدہ؟ کسی کی تعریف سے ہمیں کیا ملے گا؟ بہاروں میں اپنی گائے بھوک سے مر جائے تو کیا فائدہ؟

کسی شعبے کو لیں، صاحبِ کمال دوسروں کے دل میں صرف خوف پیدا کرتا ہے وہ تعریف چاہتا ہے، خراج لیتا ہے لیکن دیتا کچھ نہیں۔ ڈرامہ لکھنے والوں کو ملتا ہے۔ دیکھنے والوں کو کیا ملتا ہے۔ وقت ضائع ہوتا ہے، بجلی خرچ ہوتی ہے اور ڈھن خراب ہوتا ہے۔ بچے ٹی وی دیکھتے ہیں اور امتحان میں برا حال ہوتا ہے۔ پھر اس قوم کے نوجوان ایک مسئلہ بن جائیں گے! اس سے کیا فائدہ؟

تعریف کرنا یا تعریف سننے کی تمنا کرنا دراصل زندگی کے بے مصیبت ہے۔ جب تک کوئی کسی کو قابل ذکر منفعت نہ پہنچائے۔ اس کی کیا تعریف۔ اپنے خیال کی ترقی بے معنی ہے، جب تک دوسروں کے حال کی ترقی نہ ہو۔ ضرورت سے محروم نہ اس کائنات اور کائنات کے انوار اور صاحبانِ کمال کے کمالات کو کیا خراج دے گا۔ یہی عجیب بات ہے کہ موکل کا مقدمہ عدم تو جہی اور عدم ہیروی کی وجہ سے خارج ہو جاتا ہے اور وہ بے چارہ اپنے وکیل کی عزت بھی کرتا ہے۔ مال بھی

دیتا ہے ہو کیل کو اور مجبورو بے بس اپنی حالت پر روتا بھی ہے۔

اساتذہ کرام کا ذکر نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اساتذہ تو اساتذہ ہیں۔ علم والے علم دینے والے، طالب علموں کی زندگی بنانے والے۔ اور اگر سچ کہنے پر آمادگی ہیں تو طلبہ کی زندگی سے کھیلنے والے، علم کو مال میں بدلنے والے، کلاس کے اوقات میں گھر کے کام کرنے والے اور کلاس ٹائم کے بعد ٹیوشنوں پر زور دینے والے۔ شاہینوں کے نشیموں میں کرگسوں کے جھوم۔

اساتذہ سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ ان کا کیا فائدہ ہے؟ طلبہ کو کیا فائدہ ہوا۔ پاس ہونے والے طلبہ کو داخلہ نہ ملا۔ فیل ہونے والوں کو تو حشر ہی نہ پوچھو۔ آخر اس تعلیم کا کیا فائدہ؟ آخر کیا فائدہ؟ امراء کے مالائق بچے امیر ہی رہیں گے۔ صاحبانِ مرتبہ ہی بنیں گے۔ غریبوں کے بچے، لائق بچے، اپنی غریبی کے اس پاس ریگلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ بے فائدہ؟ امیر کے بچوں کو پڑھنے کا کیا فائدہ؟ غریب کے بچوں کو بھی پڑھنے کا کیا فائدہ؟ امیر، امیر رہے گا، غریب غریب۔

آخر اس زندگی کا بھی کیا فائدہ؟ انسان پابندِ زمان و مکاں ہی رہے گا، شام کو سوئے گا، رات کو خواب دیکھے گا، دن گردشوں میں رہے گا۔ خوشی کے چند ایام، غم کے لمبے سلسلے۔ انس کیا کرے! بنانے والے سے پوچھنا گستاخی ہے، سوئے اوب ہے۔ موت ہی جب زندگی کا انجام ہے تو یہ ساری کوشش کیا ہے؟ زندہ رہنے کے لیے یا مرنے کے لیے!

لیکن نہیں، ایسا نہیں۔ انسان ہی باعثِ تخلیق کائنات ہے۔ وہی وارث کائنات ہے۔ انسان صرف صحت مند سوچ سے محروم ہو رہا ہے، ورنہ یہ سب نظام



ایک مربوط اور خوبصورت نظام ہے۔ نظاروں سے لطف حاصل کیا جاتا ہے، ان سے فائدہ نہیں، مانگا جاتا۔ سجدوں سے تعلق کا واسطہ ہے، اذیت کا نہیں۔ روشنی، روشنی ہے، نور ہے۔ سب کے لیے یکساں؟

انسان اپنے آپ سے بیزار ہے، مورنہ ہر جا جہان دیگر ہے۔ غور کرنے کا حکم ہے۔ غور کیا جائے۔ سوال کرنے کا حکم نہیں۔ سوال تو ہم سے ہوگا۔ ہر شے سے فائدہ، نگنا ہی زندگی کے طیف احساسات سے محرومی کا باعث ہے۔ امیری غریبی، سکھ دکھ، دھوپ چھاؤں۔ زندگی کے ہی نام ہیں۔

زندگی بدلتی رہتی ہے۔ ایام بدلتے رہتے ہیں۔ ضرورت پوری ہونہ ہو، زندگی کا سلف ختم نہ ہو۔ شعر، شعر ہے، راحت قلب و جاں۔ دل کا سرور ہے۔ شعر سے فائدہ نہیں حاصل کیا جاتا۔ اس سے لطف حاصل کیا جاتا ہے۔ جگمگاتے ستارے، جھلکتے آنسو اچھے لگتے ہیں۔ ان کا فائدہ؟ پھر وہی بات۔ آخر فائدے کا ہی کیا فائدہ ہے؟ زندگی سے زندگی کے علاوہ کیا چاہیے۔ عبادت سے، سوائے عبادت نکال دو تو معلوم ہوا کہ اصل منفعت کیا ہے۔ زندگی سے تمنائے منفعت، اندیشہ زیاں نکال کے زندگی کا لطف لے کر دیکھو۔ کبھی تو دکان بننا چھوڑو۔ ہر کام سے فائدے تلاش کرنا، یہ کیا تلاش ہے۔ اپنے وجود میں نوری وجود تلاش کرو۔ اس کائنات میں اپنی کائنات دریافت کرو۔ لذت وجود ہی تو زندگی نہیں۔ روح کی تو خور کیا ہے؟ اسے تلاش کرو۔ اپنے باطن کا سفر کرو۔ اپنی گتھڑی کی گرہ کھو۔ اپنے دل کی دنیا کی سیر کرو۔ گلاب کے رنگ اور اس کی خوشبو نے بنبل کو ترنم بخش۔ آپ گلاب سے گل قند بناتے ہو۔ آپ کیا کرتے ہو؟ رنگوں سے بے بہرہ، نعمت سے محروم، عقل کے اندھے، خوشیوں سے مال مانگتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟ بنانے

والے نے جو بنایا وہی اصل ہے۔ دینے والے نے جو دیا، وہی اصلی ہے، کرنے  
والے نے جو کیا، وہی حسن تخلیق ہے فائدے کا سفر بے فائدہ ہے۔



## تعریف

تعریف سننے کی تمنا انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے، لیکن اس کمزوری کے اندر بعض اوقات انسان کی طاقت پنہاں ہوتی ہے۔ تعریف سننے کی آرزو میں انسان کے اندر خوابیدہ فنکار بیدار ہوتا ہے۔ فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے اور خراج تحسین وصول کرتا ہے۔ فن کی بقا تعریف کے دم سے ہے۔ تعریف نہ ہو تو فن السردہ ہو جاتا ہے۔

انسان کی صفات تعریف کی متقاضی ہیں۔ تعریف، خوشامد نہیں۔ خوشامد، بغیر صفت کے تعریف ہے۔ خوشامد اس بیان کو کہتے ہیں جس کے دینے وال جانتا ہے کہ جھوٹ ہے اور سننے والا سمجھتا ہے کہ سچ ہے۔ خوشامد سننے کا طالب مریض ہے اور خوشامدی اس مرض میں ضائع کرتا ہے۔

بادشاہوں کو ظل سبحانی کہلانے کا شوق دربار کو خوشامدیوں کی آجگاہ بنا دیتا ہے اور یہ درباری بادشاہوں کی آنکھوں پر خوشامد کی خوبصورت پٹیاں باندھ کر انہیں ان کی اصیت سے بے خبر رکھتے ہیں۔ ملکی معاملات کی اصدا ح کی بجائے شہنشاہ اپنے قصیدے سنتے ہیں اور رعایا کو مرثیہ خوانوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

تعریف نہ ہو تو شاید دنیا میں اتنا ہنگامہ نہ ہو۔ لوگ جائز ناجائز دولت ماکر گھروں کو سجاتے ہیں۔ ان میں قمقمے لگاتے ہیں۔ روشنیاں کرتے ہیں اور پھر دوستوں کو دعوت دیتے ہیں۔ تعریف ہوتی ہے اور پھر ہوتی ہی رہتی ہے۔ گھروں میں چراغاں رہتا ہے اور دل اندر سے بجھتے جاتے ہیں۔ مال کی تعریف، مال کی نمائش کی تعریف انسانوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ جس انسان میں ذاتی صفات نہ ہو

ۛ، وہ اپنے لباس سے لے کر اپنے مکان تک اپنی ہر شے کی تعریف چاہتا ہے۔

تعریف کی تمنا انسان کو بڑے کرب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وطن میں تعریف سننے کی تمنا میں انسان پردیس تک پہنچ جاتا ہے۔ مال کماتا ہے۔ پردیس کی اذیت برداشت کرتا ہے اس کے گھر والے دولت کا اظہار کرتے ہیں، تعریف سنتے ہیں اور وہ پردیس میں تہائی کی بھٹی میں جلا ہے۔ سال میں ایک آدھ دفعہ وطن واپس آتا ہے۔ دوستوں کو جمع کرتا ہے۔ مال خرچ کرتا ہے۔ تعریف سنتا ہے اور پھر آزدہ خاطر پردیس کی اجنبیت کے حوالے ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات تعریف کی آرزو میں انسان جان پر بھی کھیل جاتا ہے۔ وہ اپنی موت کو قابل تعریف بنانے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ تعریف کا زخم سب سے گہرا زخم ہے۔

اس کا مندل ہونا مشکل ہے۔ تعریف سننے کی بیماری میں مبتلا انسان کی اگر تعریف بے کی جائے تو وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے اگر آپ کا دوست نیا لباس زیب تن کر کے آپ کے پاس آئے اور آپ کسی وجہ سے اس کے لباس کی طرف توجہ نہ کریں تو آپ کی دوستی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

انسان کی تمام تراش خراش، بن سنور، سج دھج، اس کا بانگین، اس کا دم ٹھم، اس کا لب و لہجہ، اس کے ناز و ادا، اس کی حرکات و سکنات تعریف طلبی کے حربے ہیں ایک پہلے سے مقروض انسان نیا قرضہ لے کر اپنے بیٹے کا ولیمہ فائیوٹل میں صرف س بے کرتا ہے کہ اس کی تعریف ہو۔ تعریف کرنے والے اس کی تعریف کرتے ہیں، لیکن دل ہی دل میں اس کی کوتاہ اندیشیوں کے تذکرے کرتے ہیں۔

اس کے قرض خواہ کیا اس کی تعریف کرتے ہوں گے۔

اگر انسان کی شکل بہتر ہے تو اس میں اس کا اپنا کیا کمال ہے۔۔۔ انسان میں انسان کا اپنا کیا ہے؟

امیر آدمی کی تعریف، غریب کو اس کے حق سے محروم رکھنے کا جواز ہے۔ اگر ہم دولت مندوں کی آرائشوں کی تعریف کرنا چھوڑ دیں تو شاید دنیا میں ظلم کم ہو جائے حق والوں کو حق سے محروم کر کے ظالم اپنی دولت کی تعریف سنتا ہے اور یوں معاشی ناہمواریاں قائم رہتی ہیں ظالم اپنے ظلم کو فن کے طور پر ظاہر کرتا ہے اور تعریف کرنے والے اسے داد دیتے ہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو تعریف کی داستان میں ظلم کی داستان پنہاں ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں، بڑے بڑے ممالک ہر ترقی یافتہ ممالک قابل تعریف کا رٹا سر انجام دیتے ہیں لیکن انے پیچھے وہ مظالم مخفی ہوتے ہیں جو وہ انسان پر روا رکھتے ہیں۔ انسان دوست ممالک افغانستان میں دوستی کا حق ادا کر رہے ہیں، آج آدمی دنیا کرب میں مبتلا ہے اور باقی کی دنیا قابل تعریف ٹھہرائی جا رہی ہے۔

سائنس نے بڑے بڑے قابل تعریف کا رٹا سر انجام دیئے۔۔۔ بس کائنات کی تغیر کا سہرا سائنس کے سر ہے اور ایٹم بم کی تباہ کاریاں بھی اس تعریف کے پردے میں موجود ہیں زندگی کو آسانیاں عطا کرنے کا دعویٰ رکھنے والی تہذیبیں زندگی کو عذاب میں مبتلا کر رہی ہیں آج کے انسان کو آسائشیں عطا کر دی گئی ہیں۔ بیماریوں کے بے ہمتاں قابل تعریف کا رٹا منہ ہے۔ زندگی کی حفاظت کا دعویٰ کر کے تعریف سننے والے زندگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں امن کے پجاری جنگ کی تیاری کر رہے ہیں تعریف کی لائی ہوئی تباہی اپنی قباحتوں کا مظاہرہ

کرنے والے ہے۔ اگر تعریف کرنے والے مزاج بدل جائے، تو تعریف سننے والے کا مزاج ضرور بدل جائے گا۔

تعریف سننے والے انسان کی اصلاح اس وقت ممکن نہیں، جب تک تعریف کرنے والے کی اصلاح نہ ہو۔ بہر حال تعریف حد سے نہیں بڑھنی چاہیے۔ تعریف کے باب میں سب سے زیادہ خطرناک وہ مقام ہے، جب کوئی کم ظرف اپنی زبان سے اپنی تعریف کر رہا ہو۔۔۔ یہ عذاب ہے۔ کوئی آئینہ اسے اس عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ تعریف جہاں انعام ہے، وہاں سزا بھی ہے۔ تعریف صفت ساز بھی ہے اور صفت شکن بھی۔۔۔ لیکن اپنے منہ سے اپنی تعریف، اپنی انسانیت کی تذلیل ہے۔



## خاموشی

خاموش انسان، خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں،۔۔۔ خاموشی خود ایک راز ہے اور ہر صاحبِ اسرار خاموش رہنا پسند کرتا ہے۔ خاموشی دانا کا زیور ہے، وراحمق کا بھرم۔۔۔ خاموشی میں عافیت ہے۔۔۔ اگر ہم زبان کی پھیلائی ہوئی مصیبتوں کا چارہ لیں تو معلوم ہوگا کہ خاموشی میں کتنی راحت ہے۔ زیادہ بولنے والے انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ سچ اور جھوٹ کو ملا کر بولے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہو تا کہ وہ سوچ سکے کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا۔

فطرت کے عظیم شہکار ایک مستقل اور مسلسل سکوت میں ہیں۔ پہاڑوں کے عظیم و وسیع سلسلے خاموش ہیں۔ اس خاموشی میں کتنی داستاںیں پنہاں ہیں۔ اس سکوت میں کتنی ہیبت ہے۔ اس سنائے میں کتنے راز ہیں۔ پہاڑ اپنے پہلو میں کتنے گنجینے رکھتے ہیں، کوئی کیا جانے، کوئی کیا سمجھے۔ پہاڑوں کے اندر خزانے ہیں، پہاڑوں کے اوپر خزانے ہیں پہاڑوں کے پتھر بھی عجب راز ہیں۔۔۔ سب خاموش، سب ساکت۔ کبھی کبھی اس مہیب سنائے میں ہوائیں چنچتی ہیں۔ ہوا کی آواز پہاڑوں کی خاموشی کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے

پہاڑوں سے گرنے والی آبِ حیاتیں اور ان کی آواز خاموشی کو زیادہ معنی خیز بنا دیتی ہے۔ خاموشی کا اثر اس وقت گہرا ہو جاتا ہے جب چھوٹی سی آواز گونج پیدا کرے پہاڑوں میں جب آوازیں گونجتی ہیں، سنائے اور مہیب ہو جاتے ہیں۔ پہاڑوں کی خاموشی فطرت کی خاموشی ہے۔ اہل دل حضرات پہاڑوں میں اپنا مسکن بنا لیتے ہیں تو اس میں یہی راز ہے کہ وہ فطرت کے قریب ہونا چاہتے ہیں اور فطرت

بالعموم خاموشی اختیار کرتی ہے۔

ہماری زندگی کا بیشتر حصہ خاموشی میں گزرتا ہے۔ دن ہنگاموں اور آوازوں کی نذر ہوتا ہے اور رات خاموشی کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ محنت سے تھکے ہوئے انسان خاموش ہو جاتے ہیں۔ چرند، پرند، سب خاموش۔ گرمی بازار ختم ہو جاتا ہے اور ہندوکانیں یوں نظر آتی ہیں جیسے بے ربط آوازوں کے لمبوں پر تالے پڑے ہوں۔ آواز انسان کو دوسروں سے متعلق کرتی ہے اور خاموش انسان کو اپنے آپ سے متعارف کرتی ہے۔ دوسروں کو قائل کرنے کی کوششیں آواز کے کرشمے ہیں۔ خود کو مطمئن کرنا خاموشی کا اعجاز ہے۔

زندگی ایک ایسا راز ہے جو اپنے جاننے والوں کو بھی راز بنا دیتا ہے۔ زندگی کا دریا خاموشی سے روں دواں ہے۔ اس میں آوازوں کی موجودگی اس کی خاموشی کو اور گہرا کر دیتی ہے۔

زندگی سراپا اور سر بستہ راز ہے اور راز ہمیشہ خاموش ہوتا ہے۔ اگر خاموش نہ ہو تو راز نہیں رہتا۔ کہتے ہیں ایک شخص زندگی کے راز کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں سے راز ہستی دریافت کیا۔ کسی نے کچھ نہ بتایا۔ وہ بہت گھبرایا، بہت پریشان ہوا چیخا چلایا۔ آخر کار وہ کچھ مایوس سا ہو کر خاموش ہو گیا۔ ایک خاموش رات اسے اپنے اندر سے آواز آئی ”نادان! لوگوں کے دروازے کھٹکھٹانے سے راز ہستی کیا ملے گا تو نے اپنے دل کے دروازے پر بھی دستک دی ہوتی۔“ اس نے اپنے اندر سے آنے والی آواز کو سنا، سوچا، غور کیا، اسے معصوم ہو، سوہو اور خاموش ہو گیا۔

یہ راز عجب راز ہے۔۔۔ انسان کی شہ رگ سے زیادہ قریب۔۔۔ راز کی تلاش کسی بیرونی سفر کا نام نہیں۔ یہ راز اندر کا سفر ہے۔ اندر کے انسان سے راز ملتا ہے اور خاموشی میں ملتا ہے اور ملنے کے بعد خاموش کر دیتا ہے۔ ایسی خاموشی جس پر گویائی نثار ہو۔۔۔ انسان کا اصل ساتھی، اصل رہبر اس کا اپنا ذوق ہے۔ اس کی اصل منزل اس کا اپنا آپ ہے۔ اپنے من میں ڈوبنے کی دیر ہے۔ گوہر مراد مل جاتا ہے۔ آواز حجب ہے، خاموشی کا شہ راز ہے۔ باطن کا سفر، اندرون بنی کا سفر من کی دنیا کا سفر، دل کی گہرائیوں کا سفر، خاموشی کا سفر ہے۔

علم ابھین کے خلاف بات نہیں ہو رہی۔ جب راز دریافت کرنا ہو تو خاموشی ضروری ہے۔ اس کے بعد اس کا اپنا حکم ہے کہ انسان کو بولنے دے یا اسے خاموش کر دے ویسے انسان کی عافیت کے لیے خاموشی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ فطرت کے کرشمے خاموشی سے جلوہ آ رہے ہیں۔۔۔ سورج ہی کو لیں۔ اس نے کبھی اپنی روشنی کے ثبوت میں کچھ دلائل نہیں دیے، بلکہ آفتاب خود ہی دلیل آفتاب ہے۔ وہ خاموشی سے دنیا کو روشنی دیتا ہے۔ کسی سے شکریے کے دو نقطہ سننے کا بھی انتہا نہیں کرتا۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ سورج کا مذہب ہی روشنی ہے اور روشنی خاموشی ہوتی ہے۔ احسان ہمیشہ خاموش رہتا ہے۔ جنایا ہوا احسان ضائع ہو جاتا ہے۔ چاند خاموش ہے کتنا خوبصورت، کتنا منور، کیسا روشن، کیسا راز، کیا کیا کرشمے ہیں۔ خاموشی میں کروڑوں ستارے ہیں۔ اپنی اپنی منزل پر گامزن۔ کوئی شور نہیں، کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی تقریریں نہیں۔ ستارے بڑے پر اسرار ہیں۔ چل رہے ہیں، اپنے اپنے مدار میں رواں دواں، خاموشی اور اطمینان کے ساتھ فطرت کے منظر فطرت کے جلوے، کرشمے فطرت کی زبان خاموشی کی زبان ہے۔

اک تماشا ہے۔ سارا عالم تماشا ہی ہے۔ آسمان پر کرشمے ہیں۔ زمین پر جوئے ہیں۔ سب خاموش ہیں۔ صحرا کی وسعتیں، عظیم وسعتیں۔۔۔ خاموش ہیں۔ کتنا گہرا راز ہے دور تک پھیلے ہوئے صحرا، پیا سے صحرا، لب خشک ہیں لیکن لب بند ہیں۔۔۔ عجب داستانیں ہیں۔ اہل دل حضرات صحرا کی یاد اور صحرا کی پیاس کے معنی جانتے ہیں دشت و حشت اور دشت جنوں خاموش ہیں، بہت خاموش ہے، بڑا راز۔ سمندر میں طوفان ہیں لمبروں کا ارتعاش ہے، بجا لیکن سمندر خاموش ہے۔۔۔ بہت خاموش خالق کی بات ہم اس لیے نہیں کر سکتے کہ وہ خالق ہے۔۔۔ اس کے ہارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ وہ بولتا ہے اپنے محبوبوں سے، اپنے پیغمبروں سے۔ اور یہ بولتا ہے۔ دنیا والوں کے لیے، دیا کے بنائے والے خاموش ہے اور اس خاموشی کے باوجود اس کے تذکرے ہیں، اس کی باتیں ہیں، اس کے چہرے ہیں، اس کی پسند اور نا پسند کے بیانات ہیں۔ وہ خاموش ہے۔ وہ سب سے بڑا جہوہ ہے، سب سے بڑا راز ہے اور سب سے زیادہ خاموش۔ اسے مانو تو خاموش، نہ مانو تو خاموش۔ اس کی عبادت کرو تو بھی خاموش، اس سے بغاوت کرو تو بھی خاموش۔ خاموشی کو پیدا کرنے والا خود خاموش ہے۔ فرشتے خاموش ہیں، جنات خاموش ہیں۔

لیکن انسان بولتا ہے اور مسلسل بولتا ہے۔ کج نہ بول سکے تو جھوٹ بولتا ہے۔ ابہام بولتا ہے۔ اپنی ستائش میں بولتا ہے۔ فطرت کے خلاف بولتا ہے۔ خالق کا گلہ کرتا ہے زندگی کے کرب کی باتیں کرتا ہے۔ ہنگامے بولتا ہے۔ شاہی فرمان بولتا ہے۔ بغاوتیں بولتا ہے۔ کبھی بندہ ہو کر بولتا ہے۔ کبھی مولیٰ ہو کر بولتا ہے۔ تہا یوں میں بولتا ہے۔ کوئی سننے والا نہ ہو تو اپنے آپ سے بولتا ہے۔ خود سوال کرتا ہے

اور خود ہی جواب بولتا ہے۔ خود ہی ثواب بولتا ہے اور خود ہی عذاب بولتا ہے۔ کبھی صلی بولتا ہے کبھی مستقبل۔ انسان دانائی بولتا ہے، حماقت بولتا ہے، خاموش نہیں ہوتا، اس سے کہ خاموشی میں اسے اپنے رویہ ہونا پڑتا ہے اور وہ اپنے رویہ نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا، لیکن یہ بات وہ کس طرح تسلیم کرے۔ وہ کیسے کہہ دے کہ وہ بیوقوف ہے وہ نا آشنا ہے۔ وہ کچھ نہیں ہے، اس کی ہستی کیا ہستی ہے۔ اس کی بات کیا بات ہے۔ وہ اپنی لاعلمی کا علم رکھتا ہے اور پھر بھی خاموش نہیں ہوتا۔ اسے خبر ہے کہ قبل از پیدائش خاموشی کے زمانے ہیں اور مابعد خاموشی ہے۔ اس زندگی میں بھی خاموشی ہے وہ سب جانتا ہے لیکن خاموش ہونا اس کے بس میں نہیں، اسے غم ملے تو زمانے کو سناتا ہے۔ اسے خوشی ملے تو دنیا کو بتاتا ہے۔ اسے بولنے اور صرف بولنے کا شوق ہے اور اس کے لیے خاموشی اور صرف خاموشی ضروری ہے۔

انسان کو بولنے کا اس قدر شوق ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی ہر دوسرے آدمی سے ہر وقت کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہوتا ہے الفاظ کے وسیع پھیلاؤ میں معافی مفقود ہوں تو بھی انسان بولے جاتا ہے اور بولتے بولتے وہ دن قریب آ جاتا ہے جب انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے صرف جھوٹ بولا۔ اس نے بے معنی الفاظ بولے۔ اس نے بے وجہ آواز استعمال کی۔ اس نے اپنے اصل ساتھی سے کوئی بات نہ کی، کوئی بات نہ پوچھی۔۔۔ یہ ساتھی اس کا باطن ہے۔۔۔ خاموش ساتھی خاموشی سے ملتا ہے۔ کاش ہم کبھی خاموشی کے س اتھ اپنے رویہ ہوتے۔



## پریشانی

انسان پریشانی سے دو چار نہ بھی ہو تو بھی وہ پریشانی سے آشنا ضرور ہوتا ہے پریشانی، انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور مل جاتی ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ تھرتھرتی ہے۔ اپنے حالات سے ہی پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ انسان اپنی حالت کو بہتر بنانے لے ہے جب پریشان ہوتا ہے تو حالت بہتر بنانے کی صداقت سلب ہو جاتی ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ اور ہر طبقہ پریشان ہے۔ امیر پریشان ہے کہ نہ جانے کب دولت ہاتھ سے نکل جائے۔ غریب پریشان ہے کہ نہ جانے زندگی اب کیسے گزرے گی۔ نیک انسان اس لیے پریشان ہے کہ اسے برے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ نیک زندگی گزارنے کے لیے بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے نیک انسان رشوت دینا نہیں چاہتا اور رشوت بغیر اس کے کام نہیں ہو سکتے بس پریشانی ہی پریشانی ہے۔ وامدین اولاد کے ہاتھوں پریشان ہیں اور اولاد والدین سے نالسا ہے۔ بچے وامدین کا کہنا نہیں مانتے اور والدین بچوں کا کہنا نہیں مانتے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے سے پریشان ہیں۔ انسرما تھوں سے پریشان ہیں۔ ماتحت گستاخ ہیں اور ماتھوں کو گلہ ہے کہ انسرما اہل ہیں۔ اپنے لیے کچھ سے کچھ اور پسند کرتے ہیں اور ماتھوں کے لیے کچھ اور۔ حکومت سیاستدانوں سے پریشان ہے اور سیاستدان حکومت سے پریشان ہیں، جلے ہی جلے اور پریشانیوں ہی پریشانیوں ہیں، دعوے ہی دعوے ہیں، بیانات ہی بیانات ہیں، تقریریں ہی تقریریں ہیں، وعدے ہی وعدے ہیں اور پریشانی برہمتی جاری ہے۔ جسوں پر کتنی خرچ ہوتا ہے۔۔۔ خرچ کی کیل بات! خرچ بغیر تو انسان کو قبر بھی نصیب نہیں ہوتی۔



لوگوں کے مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ زندگی مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ اور پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مریض ڈاکٹروں کے روینے سے پریشان ہیں مریض سے محبت کرنے کا زمانہ گزر گیا اب تو مریض کے حال پہ نظر کرنے کی بجائے مریض کے مال پر نظر ہوتی ہے۔ پریشانی ہی پریشانی ہے۔ مریض ہونا غریب ہونے کی ابتدا ہے۔ غیر قانونی ہڑتالوں سے ہسپتالوں میں پریشانی کا جو عالم ہوتا ہے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ استاد شاگرد کا مقدس رشتہ بھی پریشان ہو کر رہ گیا ہے۔ کالج کے طلبہ اپنے اساتذہ کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں بس خدا کی پناہ۔۔۔ کسی زمانے میں طلبہ اساتذہ سے ڈرتے تھے اور آج اساتذہ طلبہ سے ڈرتے ہیں۔ استاد پریشان ہیں طالب علم کہنا ہی نہیں مانتے! استاد طلبہ کو ایسی سزا دیتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔۔۔ بڑے بڑے کالجوں کا نتیجہ خوفناک حد تک کمزور رہتا ہے۔ طلبہ نابل ہو جاتے ہیں اور یوں ایک مستقل پریشانی میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ طلبہ کلاس روم میں پریشان رہتے ہیں۔ کمروں، امتحان میں بھی پریشان ہوتے ہیں ہسٹریوں پر آ جاتے ہیں اور پھر ایک نئی قسم کی پریشانی ہوتی ہے اللہ رحم فرمائے آج کے طلبہ پر، آج کے اساتذہ پر۔۔۔ آج کی تعلیم پر۔

ہر شعبہ حیات اپنے اپنے انداز سے پریشان ہے ہر شخص اپنے، حول میں پریشان ہے، یوں لگتا ہے کہ ہر ستارہ اپنے اپنے مدار میں سرگرداں بھی ہے اور پریشان بھی!!

پریشانی حالات سے نہیں خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان اپنے موجود مجھے سے گریزاں ہوگا، وہ پریشان ہوگا۔ انسان آنے والے حالات سے خوفزدہ ہو کر جانے والے حالات کو پریشان کر دیتا ہے۔ اگر گزرے ہوئے زمانے

خوشی کے زما نے ہوں تو بھی ان کی یاد باعث پریشانی ہے کہ اب وہ دن کہاں گئے، خوشی کے دن گزر گئے۔ جوانی اور صحت کے ایام، محبت و وارثی کے دن ہوا ہو گئے۔ پریشانی تو یہ ہے کہ خوشیاں ختم ہو گئیں، وہ دن بھی کیا دن تھے، وہ زما نے بھی کیا زما نے تھے، وہ درد بھی کیا درد تھا، ساتھی کتنے وفادار تھے، اب بس یاد ہی یاد ہے۔۔۔  
- پریشانی ہی پریشانی!

اگر، صلی کسی غم سے عبارت ہو تو بھی باعث پریشانی ہے غم کی یاد ایک تازہ غم دے جاتی ہے۔ عجب حال ہے خوشی کی یاد میں پریشان اور غم کی یاد میں پریشان۔  
اسی طرح مستقبل اگر امید سے عبارت ہو تو بھی حال پریشان ہے کہ کب وہ سہانا دور آئے گا اگر خطرے کا اندیشہ ہو تو بھی حال پریشان ہے کہ انسان دور سے نظر آنے والے خطرے کو ہمیشہ قریب ہی سے محسوس کرتا ہے۔ زندگی کے نصیب میں پریشانی لکھ دی گئی ہے، کبھی اپنے لیے پریشانی ہے، کبھی دوسروں کے لیے پریشانی ہے، کبھی اس زندگی کا فکر ہے، کبھی موت کے بعد کا منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ پریشانی ہر حال میں رہتی ہے۔ پریشانی انسان کے ساتھ ساتھ رہتی ہے اس کا علاج اس وقت تک ناممکن ہے جب تک زندگی دینے والے سے نہ پوچھا جائے۔ جس ادارے نے جو مشین بنائی ہو وہی اس مشین کی حفاظت اور اس کے استعمال اور اس کی اصلاح کا عمل جانتا ہے۔

اگر زندگی ہمارے اپنے عمل کا نام ہے تو اس کے اندر پیدا ہونے والے بگاڑ و فساد کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ اگر ہم اپنا علاج ہی نہ کر سکیں تو ہمیں اپنے اختیار کی حقیقت معلوم ہونا چاہیے اگر زندگی اپنے پیدا کرنے والے ہی کو نہ مانے تو اسے پریشانی سے کون بچائے ہم اپنے آپ پر اپنی ہمت سے زیادہ بوجھ ڈال دیتے

ہیں۔ ہم خود ہی اپنی پریشانیوں کے مصنف ہیں اور خود ہی اپنی پریشانیوں سے تنگ ہیں، ہم متضاد خواہشات رکھتے ہیں ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری دم توڑ دیتی ہے، اگر دولت اکٹھی کی جائے تو رزق حلال کا تصور پریشان کرتا ہے اور اگر رزق حلال پر ہی قناعت کی جائے تو فحش حالات پر رونا آتا ہے پریشانی بہر صورت رہتی ہے۔ وطن سے باہر رہنے والوں کو وطن کی یاد پریشان کرتی ہے، وطن میں رہنے والوں کو ہر جگہ کی تمنہ پریشان رکھتی ہے۔ ہر انسان کو اپنے علاوہ کی آرزو ہے اور یہی آرزو وجہ پریشانی ہے۔

ہم اپنے علاوہ کچھ نہیں بن سکتے۔۔۔ یہ حقیقت ہی زندگی کا ضابطہ ہے اسی سے زندگی کے شعبے اور پٹی قائم ہیں، اسی سے نظام، ہستی قائم ہے ہمیں ہماری حدود میں قائم رکھنے والی قوت پریشان تو کرتی ہے لیکن یہی قوت زندگی کا راز ہے، ہر انسان حکمران بننا چاہتا ہے اگر یہ خواہش پوری ہو جائے تو کون کس کا حکمران ہوگا؟۔۔۔ عجیب پریشانی ہو جائے گی۔ کوئی انسان غریب نہیں رہنا چاہتا۔۔۔ اگر سب ہی امیر ہو جائیں تو کیا ہوگا؟ اگر دنیا کی دولت برابر تقسیم کر دی جائے تو چہرے کیسے برابر ہوں گے؟ عقل کیسے برابر ہوگی؟ دل کیسے برابر ہوں گے؟ ظہر کیسے برابر ہوں گے؟ ایک نئی قسم کی غیر مساوی تقسیم کا شعور پیدا ہو جائے گا۔ انسان علاج میں ترقی کرتا ہے۔ نئے نئے علاج دریافت ہوتے ہیں اور پھر ایک نئی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بیماری ضرور مہلک اور لاعلاج رہے گی۔ اگر علاج سائنس بن جائے تو دعا کا کیا مقام ہوگا؟

پریشانی انسان کو احساس دلاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی پر اختیار نہیں رکھتا۔ اگر انسان اس احساس پر یقین اور ایمان استوار کر لے تو وہ پریشانی سے بچ سکتا ہے نہیں

تو نہیں۔۔۔

اگر انسان تسلیم کر لے کہ اس کی زندگی اور زندگی کے ساتھ ہونے والے واقعات اور زندگی کا انجام، خالق کے حکم سے ہے تو یہ پریشانی ختم ہو سکتی ہے، گناہ اور برائی کی بات نہیں ہو رہی، زندگی کی بات ہو رہی ہے، گناہ اور برائی تو بہ سے ختم ہو سکتے ہیں تو بکا مطلب واضح ہے، خالق کو گواہ بنا کے یہ اعلان کرنا کہ آئندہ ایسا عمل سرزد نہ ہوگا۔!

بہر حال پریشانی سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو خالق کی مرضی کے مطابق بسر کرے۔ جو شخص آج کے دن، آج کے لمحے پر راضی ہو گیا وہ پریشانی سے نکل گیا۔ زندگی سے اگر گلہ اور شکایت نکال دی جائے تو پریشانی ختم ہو جاتی ہے اپنے آپ کو پسند اور دوسروں کو نا پسند کرنا چھوڑ دیا جائے تو پریشانی نہیں رہتی۔ اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کی آرزو نہ رہے تو پریشانی نہ رہے گی، اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر زندگی کا انجام موت ہے تو پریشانی کیسی! دنیا میں کوئی ایسی رات نہیں جس پر دن نہ طلوع ہوا ہو۔ کوئی ایسا دن نہیں آیا جس پر رات نازل نہ ہوئی ہو، کوئی ایسی غم نہیں آیا جو کٹ نہ جائے، کوئی ایسی خوشی نہیں آئی جو مٹ نہ جائے، کوئی ایسا انسان نہیں آیا جو ایک مقررہ مدت کے بعد واپس نہ بلا لیا گیا ہو۔ انسان پر کوئی ایسا سفر مسلط نہیں کیا گیا جس کی منزل نہ ہو۔

گردشِ شام و سحر انسان کو مسرت، صحت، دولت اور محبت عطا کرتی ہے اور یہی گردشِ اپنی عطا کو واپس لے لیتی ہے اور یوں انسان اپنے آپ سے محروم ہو جاتا ہے وہ پریشان ہوتا ہے، حالانکہ اس میں پریشانی کی بات نہیں، انسان خود ہی کسی اور طاقت کا عمل ہے، اس طاقت نے انسان کو اس سفر پر پرگامزن کیا ہے اس طاقت پر



## مجبوری

مجبور ہونا کوئی بری بات نہیں اور سچ پوچھو تو مجبور ہونا کوئی اچھی بات بھی نہیں مجبور ہونا صرف سچی بات ہے۔ انسان مجبور ہے۔ انسان مجبوری توڑنا چاہتا ہے اور فطرت اسے مجبور رکھنا چاہتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے راستے پر مجبور ہیں۔

صرف انسان ہی نہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے اپنے حصار میں مجبور ہے۔ ستارے اپنے اپنے مدار میں مجبور ہیں۔ سورج طلوع و غروب کے عمل میں مجبور کر دیا گیا ہے۔ ہر شے گویا اپنے اپنے دائرے میں گویا رہن رکھ دی گئی ہے۔ دریا کی روانی گویا اس کی مجبوری ہے، پرندوں کی پرواز، مچھلی کا تیرنا، ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، پہاڑوں کا اپنی جگہ پر بیٹھوں کی طرح گڑا رہنا مجبوری ہی مجبوری ہے۔ آسمان بند ہے، زمین ہموار ہے، پست۔ غرض یہ کہ برذات اپنی صفات کے بندھن میں ہے۔ اپنی نیت اور فطرت کے مطابق اپنے مجبور سفر پر گامزن ہے۔

کوئی شے، کوئی ذات اپنی تشکیل سے باہر عمل نہیں کر سکتی۔ یہی مجبوری ہے، یہی پہچان ہے، اور یہی اس کی خودی ہے۔ گوشت کھانے والا مر جائے گا، لیکن گھاس نہیں کھائے گا۔ شاہین مردار نہیں کھاتا، کدھ مردار ہی کھائے گا۔ مجبور ہیں دونوں۔

ایک انسان کا عمل دوسرے انسان سے مختلف نظر آتا ہے۔ ایک کا پیشہ دوسرے کے پیشے سے الگ ہے۔ ایک کی زندگی دوسرے کی زندگی کے علاوہ ہے۔ ایک اک حاصل دوسرے کے حاصل سے جدا ہے۔ ایک کی صفات دوسرے کی صفات سے علیحدہ ہیں۔ ایک کا انداز دوسرے کا انداز نہیں۔ محنت کرنے والے نکلے



سے مختلف ہوگا۔ سونے والے اور جاگنے والے برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ کامیابی اور ناکامی الگ الگ نتیجے ہیں۔ جہاں ایک انسان مجبور نظر آتا ہے، وہاں دوسرا انسان اس مجبوری کو توڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس لیے آج تک جو چاہا کی، لیکن اسی آزادی میں ہی تو اس کی مجبوری کی داستان پنہاں ہے۔

انسان آسمانوں کی وسعتوں میں چلا جائے، وہ آسمان کے دروازے کھٹکھٹائے، کائنات کے اسرار و ریاضت کرے، آزاد ہے۔ لیکن اس آزادی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کی آزادی اور آزادی کے اس کے لیے مجبوری کا پیغام لگتی ہے۔ اور آسمانوں پر بھی اڑنے والا آزاد انسان مجبور ہو کر زمین پر آتا ہے اور پھر زمین میں سما جاتا ہے۔ ابتدا مجبور ہے، انتہا مجبور ہے۔ درمیان میں آزاد ہے۔ کتنی آزادی ہوگی؟

انسان اپنے لیے مکان بناتا ہے۔ وہ آزاد ہے۔ جیسے چاہے مکان بنائے، لیکن ایک قسم کا مکان بنانے کے بعد وہ اپنے مکان کو زیا دہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ آزادی سے حاصل ہونے والی شے اپنے مالک کو مجبور کر دیتی ہے۔ شادی کرنے تک انسان خود کو آزاد سمجھتا ہے۔ جس سے چاہے شادی کر لے، لیکن شادی کے بعد مجبوری کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے لیے آزادی سے حاصل ہونے والی بیوی، دراصل اس کی مجبوری تھی۔ آزاد نظر آنے والی طرزِ حیات درحقیقت ایک مجبور طرزِ حیات ہے۔ انسان سفر کرنے کے بعد سمجھتا ہے کہ اس کے لیے وہی سفر مقرر تھا، جو اس نے کیا۔ باقی سارے آزاد نظر آنے والے راستے صرف امکانات تھے۔ حقیقت صرف ایک راستہ ہے، جس پر چلنا انسان کی مجبوری ہے۔ اسے وہ آزادی سمجھے تب بھی مجبوری ہے، اور مجبوری سمجھے تو بھی مجبوری ہی ہے۔

ہر انسان اپنے مزاج میں مجبور کر دیا گیا ہے بخیل، بخیل رہے گا۔ سخی، سخی۔  
ماننے والے، ماننے پر مجبور ہیں اور انکار کرنے والے انکار پر۔ دنیا میں رونقیں  
مجبوریوں کے ابواب ہیں۔ مجبوری کے دم سے یہ معمور آباد ہے۔

ایک گھر میں پیدا ہونے والے، ایک دسترخوان پر پرورش پانے والے  
ایک جیب ڈاکٹر، ایک جیسی فطرت نہیں رکھتے۔ ہر انسان ایک الگ فطرت پر پیدا ہو  
ا۔ ایک الگ تجربہ، ایک علیحدہ نصیب۔ غرضیکہ ہر انسان نے مزاج میں رہن رکھ دیا  
گیا ہے۔ ہر انسان اپنی تشکیل کے مطابق عمل پر مجبور ہے۔ انسان کی صفات اس کو  
آزادی کی منزل دکھاتی ہیں لیکن، یہ صفات اپنی ذات میں محدود و مجبور ہیں۔ انسان  
کی بینائی محدود و مجبور ہیں۔ دور سے نظر آنے والے مناظر قریب سے ویسے نہیں  
دکھائی دیتے۔ چاند دور سے کچھ اور ہے اور قریب سے کچھ اور۔ ہماری نظر ہی قریب  
نظر ہے۔ جو نظر آتا ہے وہی نظر کا دھوکہ ہے۔ اور اس پر ہی اکتفا نہیں۔ ہماری بینائی  
محدود تو ہے ہی سہی، کچھ عرصہ کے بعد کمزور بھی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ بینائی ہر ہی  
کیا موقوف، ہمارے اعضاء مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہم صحت کا خیال رکھتے رکھتے  
صحت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ زندگی کی حفاظت کرتے کرتے ہم غیر محفوظ ہو کر رہ جاتے ہیں۔  
ہمارے اٹائے ہمارے اختیارات کی طرح ہم سے چھٹنے شروع ہو جاتے ہیں۔  
ہماری بینائی کمزور ہو جائے تو چہروں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ ہم بیرونی  
خطرات سے محفوظ بھی ہوں تو بھی خطرات ہمارے اندر گھنٹیاں بجاتے ہیں۔  
اندیشے، گمنام اندیشے، ہمارے یقین کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں۔

ہم آزاد تو ہیں، لیکن یہ آزادی ایک محدود دائرے میں ہے۔ ہم اس کے  
محیط سے باہر نہیں جاسکتے جس طرح ہم زمین و آسمان کے حصار میں ہیں، اسی طرح

ہم اپنے حالات و خیالات کے حصار میں ہیں۔ ہم اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اپنے قد اور اپنی حد سے باہر نہیں جاسکتے۔ سود و زیاں کی سرحد ہمارے اعمال کی حد ہے۔ ہم اپنوں سے بیگانہ نہیں ہو سکتے اور بیگانوں کو اپنا نہیں سکتے۔ ہمارا حاصل محدود ہے اور ہماری تمنائیں لامحدود۔ ہم داستان ہستی مکمل نہیں کر سکتے۔ کسی کا آغاز ہو گیا، کسی کا نجوم۔ ہم جس راستے پر ہیں اسی راہ میں لٹ جاتے ہیں۔ ہمارا ہونا نہ ہونا ہو جاتا ہے اور ہم ہم نہیں رہتے۔ آزادیاں واہمہ نظر آتی ہیں، لیکن ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں اپنے اعمال کی وجہ سے جواب دہ ہوں گے۔ انسان اتنا ہی ہے، جتنی وہ کوشش کرتا ہے۔ یہی امر تو قابل غور ہے۔ مجبوریوں کے حصار میں رکھے ہوئے انسان کو آزادی کا پیغام ہے۔ عجب مقام ہے۔

انسان کو جتنی آزادی دی گئی ہے، اتنا ہی اسے جواب دہ بنایا گیا ہے زندگی کے محدود ایام میں ہمارے عمل اپنے نتیجے اور اپنی نیت کے حوالے سے جواب دہ ہے۔ کھانا کھناتو فرض ہے یعنی مجبوری ہے، لیکن حلال حرام کی تمیز میں انسان آزاد ہے۔ کھانا تو کھائے گا انسان، لیکن کیسے؟ حلال یا حرام۔ رزق کے انتخاب میں ہم جواب دہ ہیں۔ انسانوں سے سلوک میں ہم جواب دہ ہیں۔ عبادات کے سلسلے میں ہم جواب دہ ہیں، انسانوں میں جتنی صلاحیت ہے، اتنا ہی وہ جواب دہ ہے۔ اندھا آدمی بینائے کے حوالے سے جواب دہ نہیں ہے۔ ہمیں جو ملا اس کے استعمال میں ہم جواب دہ ہیں۔ ہمارا فطری حاصل مجبوری ہے اور اس حاصل کے استعمال میں ہم آزاد ہیں، جواب دہ ہیں۔

آزادی یہ ہے کہ ہم مجبوریوں کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے بینائے سے کیا دیکھا۔ نیک مقامات کی زیارت یا نفس کے عشرت کدے۔ ہم نے محدود

وَأَعْمَقُ لِي وَأَعْمَقُ

زندگی کو کیسے استعمال کیا۔ گلہ، شکوہ، شکایت، مایوسی، بغاوت، یا اسے شکر، امید، محبت اور عبادت میں صرف کیا پانے والے راز حیات پانے اور کھونے والے اپنا آپ بے باکر کے رخصت ہوئے۔ ویرانیاں چھوڑ گئے۔ ایک انسان نے کہا کہ جب مر ہی جانا ہے تو عمل کیا ہے۔ دوسرے نے کہا چونکہ مر جانا ہے اسی لیے عمل ضروری ہے۔ کچھ لوگ اسی مجبور زندگی میں بے بسی محسوس کرتے ہیں اور مایوسی سے نکل نہیں سکتے کچھ لوگ اسی مجبور زندگی میں امید کے چراغ روشن رکھتے ہیں، عمل میں سرگرم رہتے ہیں اور اس زندگی اور آنے والی زندگی کو کامیاب بنا لیتے ہیں۔ مجبوری اور آزادی انسان کے اپنے انداز فکر کے نام ہیں خالق کے باغی آزادیاں چاہتے ہیں۔ انہیں قدم قدم پر مجبوری روک لیتی ہے۔ تسلیم کرنے والے مجبوریوں میں مطمئن ہیں۔ انہیں قدم قدم پر نئی آزادیوں سے تعارف ہوتا ہے۔

انسان کا عجب حال ہے۔ زندگی غیر مستقل ہے اور اس میں مستقل رہنے کی آرزو انسان میں پکتی رہتی ہے۔ انسان رہنا نہ ہونے سے پہلے مستقل ہونا چاہتا ہے۔ اس زندگی کا مزاج ہی بے ثباتی ہے۔ اس میں ہمیشہ کسی کو قیام نصیب نہیں ہوا آنے والے ضرور جائے گا اور پیدا ہونے والا ضرور مرے گا۔ لیکن اسی مجبور سر زمین حیات میں آزادی کے گلاب کھلتے رہتے ہیں۔ بات احساس کی ہے، انداز کی ہے، زندگی کے نصیب میں مجبوری ہے اور اس کے مزاج میں آزادی ہے۔ ہم نہ ہمیشہ سو سکتے ہیں، نہ ہمیشہ جاگ سکتے ہیں۔ زندگی کے ابدی نظام کو خوشی سے قبول کرنے والے ہی راحت حاصل کرتا ہے۔ زندگی کی تکلیف اور مجبوری کو اہل دل حضرات، اہل عشق، اہل محبت حضرات نے آزادی کا نغمہ بنا کر دکھایا ہے۔ فنا کی بستی میں بقا کے مجبور یوں سے آزاد کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ اپنے وجود سے تکلیفیں تو چاہنے والوں

**قلم قلم، قلم قلم**

وہ صفت علی و صفت

کے دل میں یہ دہن کر ہمیشہ کے لیے موجود رہے ہیں۔ محبت مجبور کو مختار بنا دیتی ہے  
عشق مجبوریوں کے حصار سے آزاد ہو جاتا ہے۔ بندہ آزاد، بندہ محبت ہے۔ شکم  
پرست ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجبور۔

## جمہوریت

جمہوریت ایک ایسا نظام سیاست ہے جس کی تعریف بس سے باہر ہے۔ دنیا والوں کے ہاں اس کی تعریف یہ ہے کہ عوام کی رائی ہوئی عوام، عوام کی حکومت، عوام کی خاطر۔ اگر دینی معاشرے میں طرز حکومت کی تعریف مقصود ہو، تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دینی حکومت دراصل اللہ کی حاکمیت ہے، اللہ کے بندوں پر، اللہ کی خاطر۔ دونوں میں فرق صاف ظاہر ہے۔

جمہوریت اپنے تمام تر فوائد کے باوجود کبھی دینی حکومت نہیں ہو سکتی۔ لہذا دینی معاشرے میں جمہوری طرز حکومت کا قیام صرف ناممکن ہی نہیں، نامناسب اور نا روا ہے۔

اول تو اللہ کا ہونا ہی انسانوں کے وہنوں سے نہیں۔ اللہ خود جمہوریت کے مزاج سے بہت بند ہے۔ لوگ مانیں یا نہ مانیں، وہ اللہ ہے۔ اللہ کے پیدا کیے ہوئے انسان اکٹھے کو نہیں مانتے۔ اس کی حاکمیت کو اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو فرق نہیں پڑتا۔ زمین و آسمان کے لشکر اگر باغی بھی ہو جائیں تو بھی اللہ مالک رہتا ہے، خالق رہتا ہے، مالک الملک رہتا ہے۔ فانی مخلوق کو باقی رہنے والی ذات مطلق کے وجود اور اس کی حکومت کے بارے میں ووٹ دینے کا حق ہی کیا ہے؟

کسی انسان کی مرضی ہو یا نہ ہو، اللہ اللہ ہی ہے حق و قیوم، قائم و دائم، اعلیٰ و ارفع، قسیم، قدیم۔ اللہ کا مزاج جمہوریت سے بے نیاز ہے۔ وہ کسی اکثریت کے سامنے جواب دہ نہیں۔ جمعی تو وہ اللہ ہے۔ اللہ تو اللہ ہے ہی سہی، اللہ کے پیغمبر بھی انسانوں کے ووٹ اور اکثریت رائے سے نہیں بنتے۔ جس طرح اللہ، اللہ ہے، اسی



طرح پیغمبر بھی پیغمبر ہی ہے۔ کثرتِ رائے کا کسی نبی کی ثبوت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ تو پیغمبروں کی بات ہے۔ اب ذرا غور کریں۔ پیغمبر آخر الزماں کے ہا رہے ہیں۔ آپ اہم الانبیاء ہیں اور آپ کا مرتبہ نبیوں کے ووٹ کا محتاج نہیں۔ آپ جو کچھ بھی ہیں، انسانوں کی رائے سے نہیں، اپنے خدا داد مرتبے سے ہیں۔

اگر کوئی شخص آپ بھیسی صفات بھی رکھتا ہو اور اس کے ماننے والوں کی کثیر تعداد بھی ہو تو بھی اس کا مرتبہ آپ کے مرتبے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ آپ کا امتی ہوئے کا شرف حاصل کر سکتا ہے پیغمبر انسانوں کی رائے یا پٹی صفات کے بل بوتے پر پیغمبر نہیں۔ وہ اللہ کے فیصلے سے پیغمبر ہیں۔ اللہ کے دیے ہوئے مرتبے سے، انسانوں کی رائے یا فرشتوں کی کثرتِ رائے سے نہیں۔ ذاتِ مطلق کی مرضی، مطلق سے آپ پیغمبر ہیں۔ آپ کا مقام انسانوں کا دیا ہوا نہیں، اللہ کی عطا سے ہے۔

پیغمبر کے پیغمبر ہونے میں جمہوریت کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ آئیے اسلام کی طرف۔ مسلمانوں کی رائے سے دین اسلام، اسلام نہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ اسلام اسلام ہے۔ یہ دین کثرتِ رائے کے احترام سے دین نہیں بنا۔ یہ اللہ کے حکم سے ہے۔ اللہ کی مرضی سے ہے، اللہ کی عطا سے ہے، اللہ کے فیصلے سے، جمہوریت کا اس میں دور تک دخل نہیں۔ اگر دنیا کی کثیر آبادی غیر مسلم ہو تو اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ اسلام خدا نخواستہ غلط دین ہے۔ اسلام سچا دین ہے۔ اسلام کے ماننے والے اقلیت میں ہوں تب بھی سچا ہے۔ اس کے ماننے والے ختم بھی ہو جائیں تو بھی یہ دین سچا ہے۔ جمہوریت دین کے معاملے میں دخل نہیں دے سکتی۔



نئے گا، غضب ہو جائے گا۔ جھوٹا ووٹ سچے ووٹ کے برابر۔۔۔

آج تک اسلام کے نافذ نہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں سے رائے مانگی جاتی رہی۔ ورنہ مسلمانوں پر اسلام نافذ نہ ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ کے بندوں پر اور اللہ کے ماننے والوں پر، اللہ کے دین کو نافذ نہ کرنے کی وجہ؟ کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ غلطی ضرور موجود ہے کیا، جمہوریت اس غلطی کو دریافت کر کے اسے دور کرے گی؟ قطعاً نہیں۔ جمہوریت اپنا نفاذ کرے گی، دین کا نہیں اور نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کا سمجھنا مشکل نہیں۔

جمہوریت کا سفر جلسوں کا سفر نہیں، جلوسوں کا سفر نہیں، تقریروں کا سفر نہیں، جھوٹ سچ مد کر بولنے کا سفر نہیں، حکومت سابقہ کی مخالفت کا سفر نہیں، گٹھ جوڑ اور توڑ پھوڑ کا سفر نہیں۔ جس طرح امن دو جنگوں کے درمیانی وقفے کا نام ہے، اسی طرح کہیں جمہوریت، رشل لاء اور مارشل لاء کے درمیانی عرصے کا نام نہ ہو۔ جمہوریت جو ہر شے نہیں۔ جمہوریت صرف مقدار کی قائل ہے، معیار کی نہیں۔

جمہوریت سقراط کو زہر پلاتی ہے۔ منصور کو سولی پر چڑھاتی ہے۔ عیسیٰ کا احترام نہیں کرتی۔ جمہوریت کے ذریعے کوئی مفکر، امام، دانشور، عالم دین، ولی یا مرد حق آگاہ برسر اقتدار نہیں آ سکتا اور جو لوگ جمہوریت کے مہنگے راستوں سے ایوان اقتدار میں آتے ہیں ان کو دینی حکومت کے قیام سے کیا غرض! جب تک عوام میں حق پسند، حق طلب اور حق آگاہ لوگوں کی کثرت نہ ہو، جمہوریت ایک خطرناک کھیل ہے!!!

## خطرہ

اگر اینٹوں میں ربط نہ ہو تو آندھی تو کجا، دیوار کو اپنے ہی بوجھ سے گر جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اندورنی کمزوری کو بیرونی خطرات ہمیشہ درپیش رہتے ہیں۔ شکستہ جہاز کو کوئی ہوا بھی تو اس نہیں آتی۔ بیمار وجود کے لیے ہر موسم خطرے کا موسم ہے۔ قوتِ مدافعت نہ رہے تو بیماری کا شائبہ بھی زندگی کے بے خطرہ ہے۔

جب قوموں کے اندر وحدت نہ رہے تو اس انتشار کی سزا ایک نامعلوم خطرے کی شکل میں موجود رہتی ہے مایوس انسان پر خطرات کی دبا کا عذاب نازل کیا جاتا ہے۔

آج ہمارے گرد و پیش خطرات ہیں۔ ہمارے بیمار و یمن میں خطرہ ہے۔ ہمارے دروازے پر خطرہ دستک دے رہا ہے۔ ہم کرب سے گزر رہے ہیں۔ یمنوں کو اپنے مکان میں سکون نہیں، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی صورت میں کوئی نہ کوئی خطرہ موجو د ہے۔

آج کی دنیا کو ترقی کے ضوالے سے تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ترقی یافتہ، ترقی پذیر، اور پسماندہ۔ ترقی یافتہ وہ ممالک ہیں، جو خوف پیدا کرتے ہیں۔ ترقی پذیر وہ ممالک ہیں، جو خوفزدہ رہنے پر مجبور ہیں اور پسماندہ وہ ممالک ہیں جنہیں خطرے کے احساس سے بھی آشنائی نہیں۔ جنہیں زندگی کا احساس نہ ہو، انہیں موت کا کیا خوف!!

خوف اور اور خطرہ صرف ترقی پذیر ممالک کے لیے ہے۔ ہم ترقی پذیر

ہیں۔ ہم خوف میں ہیں۔ ہمارے مغرب میں ترقی یافتہ روس ہے، جو خوف پیدا کرتا ہے۔ مشرق میں ایک ایسا ملک ہے جو ترقی پذیر ہونے کے باوجود ترقی یافتہ انداز رکھتا ہے۔ بھارت خود خوف میں ہے، لیکن خوف پیدا کرتا ہے۔

ترقی کا دوسرا نام خوف پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ بھارت کے پاس یہ صلاحیت ہے، اس کی نگاہ میں آج بھی یہ پاکستان خارج بن کر کھٹکتا ہے۔ اس کی وجوہات کچھ بھی ہوں، نتیجہ یہ ہے کہ ہم خطرے میں ہیں۔

دوست کمزور ہو جائیں تو دشمن خود بخود طاقتور ہو جاتا ہے۔ اندرونی منتشر، بیرونی پیغار کی راہ ہموار کرتا ہے۔

ہم ایک ایسے خطرے میں ہیں جو محسوس تو ہوتا ہے کہ یہ خطرہ کس چیز سے ہے۔

کیا ہم پر خدا نخواستہ کوئی نئی افتاد پڑنے والی ہے؟

کیا ہم اپنے اعمال کی عبرت کے خوف میں ہیں؟

کیا ہم اپنے راہنماؤں سے مایوس ہو چکے ہیں؟

کیا ہم گردش حالات کی زد میں آ چکے ہیں؟

کیا ہم سے زندگی کے عظیم مقاصد چھن چکے ہیں؟

کیا ہم اعتماد سے محروم ہو چکے ہیں؟

کیا ہمیں اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں؟

کیا ہمیں جان کا خطرہ ہے، ایمان کا خطرہ ہے، عزت کا خطرہ ہے، ملکی  
سمد متی کا خطرہ ہے، ملی وحدت کا خطرہ ہے؟

کیا خطرہ ہمارے اندر ہے یا باہر ہے؟

کیا آسمان گرنے والا ہے؟

کیا زمین پھٹنے والی ہے؟

کیا انسان کے گناہوں کا پلو جھاتا بڑھ گیا ہے کہ کسی عذاب کا نازل ہونا  
گرمی ہے؟

کیا ہماری تاریخ ختم ہونے والی ہے؟

کیا ہم ایک سطحی اور نقلی زندگی گزار رہے ہیں؟

کیا ہمارے فکر پریشان ہیں؟

کیا ہمارا کردار ختم ہو چکا ہے؟

کیا ہم سے حسن عمل چھن گیا ہے؟

کیا ہم دلوں کا آسرا بھول چکے ہیں؟ ہم قدم قدم پر خطرے میں ہیں۔

کیا ہمارا عمل بیان اور صرف بیان ہے؟

کیا ہم اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں؟

آخر ہم نے کیا کیا ہے کہ ہم خطرے میں ہیں؟





ہم ایک دفعہ پہلے تقسیم ہو چکے ہیں ہمارے پاس آج بھی حالت چھٹ نہیں اور دشمن پہلے سے زیادہ طاقتور ہے۔ ایک دفعہ ہونے والا حادثہ، کیا دوسری دفعہ نہیں ہو سکتا؟ خوف تو ہوگا!

لیکن نہیں بات اتنی خطرناک بھی نہیں۔ دامن اعمال خالی ہو تو ہو۔ دامن رحمت تو بھرا ہوا ہے۔ ہمارا سہارا ہمارے اعمال میں نہیں، اس کی رحمت میں ہے۔ رحمت کا کام ہی یہ ہے کہ محروم کو حق سے سوا دیتی ہے۔ وہ دینے والا ہے۔ جب چاہے، جیسے چاہے، جو چاہے دے دے۔ ہماری بقا صرف ہماری ہی بقا نہیں، اس کے نام کی بھی عظمت ہے۔

جب ہم غم تھے تو ہم نے ہندوستان میں اپنی آزادی کو حاصل کیا۔ ایک نیا ملک بنایا۔ آج تو ہم آزاد ہیں۔ ہم ملک کا تحفظ کیسے نہیں کریں گے۔

ہم دشمن سے ڈرنے والے نہیں۔ ہمیں اگر کبھی خوف ہوا تو صرف دوستوں کا، اپنوں سے ڈر ہے۔ اپنے، اپنے ہو جائیں تو بیگانے کا کیا خوف!

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔ اپنے اعمال اور اپنے مال میں سب کو شریک کریں۔ دوسروں کی عزت کریں تاکہ ہماری عزت محفوظ ہو۔ دشمن کوئی حرکت کرنے سے پہلے دس دفعہ سوچے گا۔ ہمیں اپنی حفاظت کے لیے سوچ کی ضرورت نہیں۔

ضرورت صرف وحدت اور صداقت کی ہے۔ ہمیں بے راہ زندگی کا خوف ہونا چاہیے۔ اسکی راہ میں مرنا ہمارے لیے خوف کا نہیں، شوق کا باعث ہے۔ ویسے اس کی راہ، حق اور حقیقت کا راستہ ہے۔ بھائی کے لیے وہ چیز پسند کرنے کا راستہ، جو



## قیادت

جب قائدین کی بہتات ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ قیادت کا فقدان پیدا ہو گیا۔۔۔ قائدین کی کثرت، ملت کو تقسیم کر کے راستے کے تعین کو دشوار بنا دیتی ہے۔۔۔ وحدت مقصد ختم ہو جائے تو کثیر المقصدیت پیدا ہو جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منزل کا مفہوم ہی مبہم ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہر قائد اپنے اپنے گروہ کو الگ الگ سمت دکھاتا ہے، الگ الگ شعور عطا کرتا ہے، الگ الگ ضرورتیں پیدا کرتا ہے، اور علاج کے الگ الگ طریقے ایجاد کر کے وہنوں کو الجھا دیتا ہے۔۔۔ ہر شخص پاکستان اور پاکستانی قوم کو کنارے لگانا چاہتا ہے اور ہر قائد ایک الگ کنارے کی نشان دہی کرتا ہے نتیجہ یہ کہ کشتی منجھدار میں رہتی ہے۔

قیادت مسیحائی کی طرح ایک وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے قوم کا پریشانی ہونا منطقی نتیجہ ہے۔۔۔ ہر قائد پاکستان کے زوال کے اسباب بیان کر لے میں رصب اللسان ہے اور عروج کا راستہ اپنی ذات تک مخفی رکھا جاتا ہے، یعنی عروج کے لیے اس قائد کے ہمراہ چلنا شرط ہے قوم کے پاس اتنے رہنما ہیں کہ بس خدا کی پناہ۔ راستہ ہی دشوار ہو کے رہ گیا ہے آج کا ہر قائد اپنی صداقت کا حوالہ ماضی سے لیتا ہے۔۔۔ قائد اعظمؒ نے یہ فرمایا ہے، وہ فرمایا ہے۔۔۔ لہذا قوم پر لازم ہے کہ وہ اس کی جماعت میں شامل ہو جائے۔۔۔ ہر قائد، اقبالؒ کے کسی شعر سے آغاز تقریر کرتا ہے اور اقبال کے ہاں اتنے اشعار ہیں کہ ہر سیاسی جماعت کے منشور کے لیے قبل ہی سند ہے۔ سبطانی جمہور کے زمانے کی نوید ہو کہ پولیس کی مجلس شوریٰ کا ذکر، دیو

استبداد کا تذکرہ ہو کہ غریبوں کو جگانے اور کاخِ امرا کے در و دیوار ہلانے کی بات ہو، اقبالؒ کے کلام میں موجود ہوگی۔ اقبالؒ انسانوں کی طرف سے اللہ کے سامنے شکوہ کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے انسانوں کو جوابِ شکوہ مہیا کرتا ہے۔ اس کے کلام میں کیا بات نہیں ہوگی۔ اقبالؒ ترقی پسند ہے۔ ارتقاء کا قائل ہے۔ استحصال کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ مساوات کا درس دیتا ہے۔ بندہ و بندہ نواز کو یک ہی صف میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اقبالؒ کا کلام آج کے بہت سے قائدین کے لیے لہجہ ہے۔ اس کے برعکس کچھ جیسے ایسے بھی ہیں جن کی ابتدا اقبالؒ کے اس شعر سے ہوتی ہے:

تو ت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے  
دہر میں اسم محمد سے اچالا کر دے

اقبالؒ نے قیادت کو جلا بخشی۔۔۔ ہر قسم کا قائد اقبالؒ کا پیروکار ہے۔۔۔ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے فرمودات ہر قائد کی زبان پر رہتے ہیں اور ایک قائد دوسرے قائد کی قیادت کے خلاف ہے۔۔۔ یہی عجب حال ہے۔

قائدین کی اکثر تقاریر چند الفاظ میں سمٹ سکتی ہیں کہ قائد اعظم کی فضا اور اقبال کی روح کے مطابق ملک و ملت کی تعمیر کریں گے۔۔۔ غریب امیر کی تقسیم ختم ہو جائے گی اور سب لوگ چین سے زندگی بسر کریں گے۔ ملک کا دافع مضبوط ہو جائے گا۔۔۔ اور۔۔۔ اور کیا؟ انتخاب کرائے۔۔۔ ووٹ دو۔۔۔ اور یہ کام جلدی ہونا چاہیے۔ ورنہ۔۔۔ ورنہ کیا؟

آج کل ہم طلسماتِ زہری کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ایک طرف

اسلام نافذ ہو رہا ہے، دوسری طرف کچھ اور نافذ ہونے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کہیں کہیں مساوات کے چرچے ہیں، کہیں نظام مصطفیٰ اور مقام مصطفیٰ کا ذکر ہو رہا ہے کہیں انتخابات کا تقاضا ہو رہا ہے کہیں احتسابات کے قصے ہیں۔ ایک شریف غیر سیا سی شہری کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اب کیا ہوگا۔۔۔ خطرات کے بڑھنے کا ذکر کرنے والے ایک سیاسی نصب العین کے تحت سرگرم عمل ہیں۔۔۔ خطرات سے یکسر غافل کر دینے والے اپنی سیاسی ضروریات رکھتے ہیں۔۔۔ اسلام سے محبت بیان کرنے والے اسلام کے نفاذ کے ساتھ اپنا نفاذ بھی مشروط رکھتے ہیں۔ نظام مصطفیٰ کے نام پر اپنے عزائم پور کرنا چاہتے ہیں۔ قوم قائدین کی کثرت سے پریشان ہے۔

یہ پریشانی دراصل ایمان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اسلام میں قیادت کا تصور دنیا کے سیاست کی قیادت کے تصور سے الگ ہے۔ مختلف ہے، نرال ہے۔۔۔ اسلام صرف پیغمبر اسلام کی قیادت میں زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔۔۔ آپ کی قیادت کے علاوہ کسی قیادت کی، طاقت و اجب ہی نہیں۔۔۔ مومن، اللہ اور اللہ کے حبیب کے احکام کا پابند ہے۔

بات کہنے کی نہیں لیکن پھر بھی۔۔۔۔۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ایک سادہ لوح پاکستانی کو حضور اکرم کے علاوہ کسی اور قائد کا خواہ وہ قائد اعظم ہی کیوں نہ ہوں، پیغام سنا دیا جائے وہ بیچارہ کچھ سمجھ نہیں سکتا کہ اسے کس کا حکم بجالانا ہے۔

ایک زندگی میں ہم کس کس کی لاج نبھائیں۔۔۔ حکومت کا حکم، ناکہ ہماری حکومت ہے اور اب تو منتخب ہے بلکہ نو منتخب ہے۔۔۔ حکومت کا حکم تو، ناکہ ہی پڑتا ہے مگر بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکومت جلے کیوں کرتی ہے۔ عوام کے کتنے ہی کام ہیں جو حکومت کے ذمے ہیں۔ انہیں ہونا چاہیے۔۔۔ بڑے شہروں میں ٹریفک



کے مسائل ہیں۔۔۔ سڑکوں اور گلیوں کی حالت ہے بجلی اور گیس کے مسائل ہیں۔۔۔ تعلیم کے بڑے ہی مسائل ہیں نوکری کے حصول کی دشواریوں کے مسائل ہیں۔۔۔ حکومت ان کو حل کرے اور اس کے علاوہ قوم کو واضح واحد مقصد حیات عطا کرے۔

اگر اسلام نافذ ہی کرنا ہے تو اللہ کی خوشنودی کے لیے کر ڈالو۔۔۔۔۔ لوگوں کی خوشنودی کی ضرورت ہی کیا ہے۔۔۔ شاید اسلام کے نفاذ کا مرحلہ مشکل ہے۔۔۔ اگر مسلمانوں پر اسلام کا نفاذ مشکل ہے تو۔۔۔ یا وہ مسلمان، مسلمان نہیں، یہ وہ اسلام، اسلام نہیں، یہ وہ قوتِ ستیا نذہ قوتِ نافذہ نہیں۔!!

بہر حال اسلام میں قیادت کا تصور یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے حکم ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول مقبول کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔۔۔ اولی الامر کی بحث نہیں۔۔۔ یہ بحث واقعہً کربلا سے ختم ہو گئی۔۔۔ اولی الامر بنی یہ نہیں تھا، امام علیؑ ہی مقام تھے۔۔۔ اگر حاکم وقت کے اوصاف اسلام کی منشا کے علاوہ ہوں تو اسے اولی الامر نہ کہو۔۔۔ اگر وہ اسلام میں فرمانبردار ہے تو اس کے اولی الامر ہونے پر غور کر لینا مناسب تو نہیں۔۔۔ بہر حال یہ فیصلے علماء صاحبان کے ہیں۔

ہم پرانے قائدین کے دن مناتے ہیں۔ صرف ایام منانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہم خود کوئی قابل ذکر واقعہ پیدا نہیں کر سکے۔۔۔ چھ ستمبر کی یاد اور پھر ملک کے دوخت ہونے کی یاد بیک وقت کیسے یاد رہے۔

ہم کچھ بھول سے گئے ہیں۔ ہمیں صرف قائد بننے کا شوق ہے۔۔۔ قائد وہ ہے جو پچھلی قیادتوں سے آزاد کر دے۔ اور مسلمان ماضی سے آزاد نہیں ہو سکتا یہی



## ذریعے میں صحرا

یہ عظیم و قدیم، جمیل و جسیم کائنات اتنی پر اسرار و پر انوار ہے کہ اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔۔۔ اس میں کیا نہیں۔۔۔

یہاں وسعتیں ہیں۔۔۔ گردشیں ہیں۔۔۔ فاصلے ہیں۔۔۔ زمانے ہیں۔۔۔  
بلکہ وسعت در وسعت، گردش در گردش۔۔۔ فاصلہ در فاصلہ۔۔۔ زمانہ در زمانہ۔۔۔  
مدار در مدار۔۔۔ محور در محور۔

اس کائنات میں عجب کھیل ہے۔۔۔ زمانے زمانوں کی تلاش میں ہیں۔۔۔  
گردشیں گردشوں کے تقاب میں ہیں۔۔۔ وقت وقت کو کھا رہا ہے۔۔۔ زندگی موت کے حصار میں ہے اور موت زندگی کی زد میں ہے

کائنات بنانے والے نے اسے بہت ہی خوبصورت اور انوکھا شہکار بنا دیا ہے۔ کہیں اتنے گرم ستارے ہیں کہ ہمارے ہاں کی آگ بھی پناہ مانگے۔۔۔  
کہیں اتنے غبارے ہیں کہ ہمارے ہاں کی برف کو بھی پسینہ آ جائے۔۔۔

کائنات تو خیر ہے ہی ایک عجوبہ۔۔۔ لیکن یہ زمین اپنے آپ میں ایک مکمل کائنات ہے۔۔۔ مختصر اور محدود زمین وسیع اور لامحدود امکانات سے مالا مال ہے۔

زمین کا حسن ہو کہ کائنات کا حسن۔۔۔ اسے جاننے اور دیکھنے کے لیے جس مخلوق کو مقرر فرمایا گیا، وہ ایک الگ شاہکار ہے۔

اس تماشا گاہِ عالم میں واحد تماشا شائی انسان ہے۔۔۔ انسان کو ایسی صفات سے نوازا گیا کہ وہ باہر کا منظر اپنے باطن میں موجود پاتا ہے۔۔۔ انسان ہی تو

کائنات کے رموز سے آشنا ہے اگر وہ آشنا نہیں تو کون آشنا ہے؟ اسی کے لیے سب جوئے ہیں۔۔۔ وہی اشرف المخلوقات ہے۔۔۔

آسمان کے کروڑوں ستاروں کو بیک وقت دیکھنے والے آ۔ بس انسانی آنکھ ہے۔۔۔ آنکھ نہ ہو تو حسن کائنات کیا ہے۔۔۔ روشنی کا وجود اپنے آپ میں لکھ موجود ہو دیکھنے والے کے بغیر عبث سا ہو کر رہ جاتا ہے۔۔۔ اندھوں کے لیے سورج کا جلوہ کیا حقیقت رکھتا ہے۔۔۔ بے شعور کے لیے اس کائنات کے رموز کیا وقعت رکھتے ہیں۔ بنانے والے نے یہ عجیب کھیل بنایا ہے۔

کروڑ ہا سال نور کے فاصلے رکھنے والی پر شکوہ کائنات کے اسرار و رموز کی آگہی کا دم بھرنے والا اتنے چھوٹے سے سیارے پر رہتا ہے، جس کے وجود کا اس وسیع کائنات کے حوالے سے ہونا نہ ہونا برابر ہے۔۔۔ اس چھوٹی سی دنیا میں، کسی چھوٹے سے ملک میں، اپنی چھوٹی سی عقل کے ذریعے اس عظیم وسعت کا احاطہ کرنا چاہتا ہے۔۔۔ یہی نہیں۔۔۔ وہ اس فطرت کے صفات و ذات کی آگہی کے شرف سے بھی اپنے آپ کو مستحقر مانتا ہے۔

یہ سب کیسے ہے۔۔۔ کیوں ہے؟ کیا ایسے ہے بھی سہی کہ نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو یہ سب کچھ ہونے کے باوجود نہیں ہے انسان نہیں تو یہ سب کچھ کیا ہے؟ اگر ذکر نہ ہو تو مذکور کون ہے؟ مذکور کو ذکر اور ذکر کا ارتقا۔ اس نے ذکر پیدا کیا ذکر ہی کے ذریعے سے مذکور و ذکر متعلق ہیں۔۔۔

وسعتیں حسن خیال میں سمٹ کے آ جاتی ہیں۔۔۔ کون و مکاں کے جوئے انسان کے دل میں موجود ہوتے ہیں۔۔۔



ماضی ایک طویل ماضی سے آشنائی، آج کا انسان کر رہا ہے۔۔۔ مستقبل سے آشنائی آج کا انسان کر رہا ہے۔۔۔ آج کا انسان آج کے انسانوں کو جانتا ہے۔۔۔ وہ کائنات کے رموز سے باخبر ہے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ کیسے؟

وہ اپنے آپ کو جاننے کے بعد سب کو جان سکتا ہے۔۔۔ خود سے آشنا سب سے آشنا ہے۔۔۔ ذرے سے آشنا ہے، صحرا سے آشنا ہے۔۔۔ قطرے سے آشنائی قلم سے شناسائی ہے۔

قابل غور نکتہ یہ ہے کہ جہاں کسی شے کا وجود ایک حقیقت ہے، وہاں اس کا اور ک ایک لگ حقیقت ہے۔۔۔ ہم وجود سے ادراک کے سفر پر روانہ ہیں۔

ہو سکتا ہے حقیقت وجود کا متعدد ہی تخلیق حقیقت ادراک ہو۔۔۔ صاحب اور ک اپنے آپ میں حقیقت کے روبرو رہتا ہے۔۔۔ وہ اپنے آئینہ میں خوبصورت، رنگا رنگ دیکھتا ہے۔۔۔ وہ نظارے کو منزل کا حاصل سمجھتا ہے۔۔۔ صاحب نظر جان لیتا ہے کہ ایک منظر دوسرے منظر سے بہت مختلف نہیں۔۔۔ ایک آنسو کسی دو سرے آنسو سے الگ نہیں۔۔۔ نئے غم اور پرانے غم سب برابر ہیں۔

درخت سے ٹوٹا ہوا پتہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنی اس کائنات کی وسعتیں۔۔۔ خلا کی پہنائیاں۔۔۔ اور بڑی بڑی کہکشاؤں کے درمیان چیخ ہوئی تنہائیاں۔۔۔

انسان با عث تخلیق بھی ہے اور حاصل تخلیق بھی۔۔۔ یہاں انسان کو اپنی ہستی کا ادراک حاصل ہو جائے تو یہ کائنات ورق ورق اس کے سامنے اپنے منہوم کے ساتھ حاضر ہے سب جلوے ایک حسن کا پر تو ہیں۔۔۔ یہ سب کثرت ایک وحدت





## موت کا خوف

موت سے زیادہ خوف ناک شے موت کا ڈر ہے۔ جیسے جیسے زندگی کا شعور بڑھتا ہے، زندگی کی محبت بڑھتی ہے، موت کا خوف بھی بڑھنے لگتا ہے۔ جس کو زندگی سے محبت نہ ہو، اسے موت کا خوف کیا ہو سکتا ہے۔

جب انسان کے دل میں موت کا خوف پیدا ہو جائے تو اس کی حالت عجیب ہوتی ہے۔ ایسے جیسے کوئی انسان رات کو اندھیرے سے بھاگ جانا چاہے یا دن کو سورج سے بھاگ جانا چاہے۔ بھاگ نہیں سکتا۔

کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو موت کا خطرہ اور خوف لاحق ہو گیا۔ وہ بھاگنے لگا۔ تیز بہت تیز۔ اسے آواز آئی ”موت تیرے پیچھے نہیں، تیرے آگے ہے۔“ وہ آدمی فوراً مڑا اور انہی سمت بھاگنے لگا۔ آواز آئی۔۔۔ ”موت تیرے پیچھے نہیں، تیرے آگے ہے۔“ وہ آدمی بولا ”عجیب بات ہے پیچھے کو دوڑتا ہوں تو پھر بھی موت آگے ہے۔“ آواز آئی موت تیرے ساتھ ہے۔ تیرے اندر ہے۔ ٹھہر جاؤ۔ تم بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ جو علاقہ زندگی کا ہے، وہ سارا علاقہ موت کا ہے۔“ اس آدمی نے کہا ”اب میں کیا کروں؟“ جواب ملا صرف انتظار کرو۔۔۔ موت اس وقت خود ہی آجائے گی، جب زندگی ختم ہوگی اور زندگی ضرور ختم ہوگی۔ زندگی کا ایک نام ہے موت۔۔۔ زندگی اپنے عمل ترک کر دے تو اسے موت کہتے ہیں۔“ اس آدمی نے پھر سول کیا ”مجھے موت کی شکل دیکھا دو نا کہ میں اسے پہچان لوں۔“ آواز آئی ”آئینہ دیکھو۔ موت کا چہرہ تیرا اپنا چہرہ ہے۔ اسی نے میت بننا ہے۔ اسی نے مردہ کہنا ہے۔ موت سے بچنا ممکن نہیں۔“

موت کے خوف کا کیا علاج! لا علاج کا بھی کوئی علاج ہے! لا علاج مرض، مہلک مرض صرف زندگی کا عارضہ جس کا انجام صرف موت ہے۔ زندگی ایک طویل مرض ہے، جس کا خاتمہ موت ہے۔ روز اقل سے زندگی کا یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے کہ زندگی کا آخری مرحلہ موت ہے۔ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ زندگی کا آخری حصہ ہے۔ ہم کشاں کشاں اس کی طرف سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہم خود ہی اس کے پاس پہنچتے ہیں۔ زندگی کے امکانات تلاش کرتے کرتے ہم اس بندگلی تک آ جاتے ہیں، جہاں سے مڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ آگے راستہ بند ہوتا ہے۔ ہم گھبرا جاتے ہیں اور پھر ہم شور مچاتے مچاتے خاموش ہو جاتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

موت نہ ہو تو شاید زندگی ایک طویل الیہ بن جائے۔ ایک طویل دورانیہ کا بے ربط ڈرامہ کہنی وی چلتا رہے اور لوگ پور ہو کر سو جانا پسند کریں۔ کہتے ہیں کہ ایک لذتی دیوی کو ایک جوان اور خوبصورت لیکن فانی انسان سے محبت ہو گئی۔ اس نے غلطی کو محسوس کیا تو فانی انسان ہے ہر جائے گا۔ وہ دیوتاؤں کے عظیم سردار کے پاس گئی کہ اے عظیم دیوتا! میرے محبوب کو لا فانی بنا دو۔ دیوتا نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ انسان کو موت کا حق دار بنایا جا چکا ہے۔ دیوی نے اصرار کیا۔ فیصلہ ہو گیا کہ اسے موت نہیں آئے گی۔ دیوی خوش ہو گئی وقت گزرتا گیا۔ بڑھاپا آیا۔۔۔ خوبصورت چہرے پر جھریاں نظر آنے لگیں۔۔۔ تو انائی کمزوری کی زد میں آ گئی۔ وقت گزرتا گیا۔ مینائی رخصت ہو گئی۔ سماعت بند ہو گئی۔ یادداشت ختم سی ہو گئی۔ مضحل ہو گئے قواء سارے۔

وہ انسان چلا یا۔ ”اے دیوی! خدا کے لیے مجھے نجات دلائیں۔ اس عذاب کو برداشت نہیں کر سکتا۔“ دیوی نے اپنی دوسری غلطی کو محسوس کیا۔ پھر حاضر



موت کے سائے میں زندگی کے ترانے گاتے ہیں۔ زندگی کا نغمہ الپتے ہیں زندگی کے اس مختصر عرصے میں جواں ہمت آسمانوں کو چھو آئے۔۔۔

علی مرتبتِ عرش کی بلندیاں سر کر آئے اور کم حوصلہ اپنے اندیشوں کے خول سے باہر نہ نکلے۔ موت فانی زندگی کو دائمی حیات میں بدل دیتی ہے فنا سے بقا کا سفر موت کے گھوڑے کی پشت پر ہوتا ہے۔ موت کے لیے تیار رہو۔ موت کا خوف نہ کرو

موت کا خوف اس لیے ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے عزیزوں سے جدا ہو جائیں گے۔ عزیزوں کو تو ہم زندگی میں ہی جدا کر دیتے ہیں۔ بیٹیوں کی رخصت کے لیے کتنی دعا مانگیں کرتے ہیں؟ ہم صاحبِ تاثیر اسی بزرگ کو کہتے ہیں جو ہماری بیٹیوں کو رخصت کرادے۔ اور صاحبانِ تاثیر ہیں کہ جدائیوں کے لیے بھی دن نہیں کرتے۔ کیونکہ جدائی تو آخر ہو ہی جاتی ہے۔ ایک آدمی کا باپ فوت ہو گیا۔ وہ بڑا رویا۔ بڑا پریشان ہو۔۔۔ موت نے بڑا ظلم کیا اسے چمن نہ آیا۔ اس کے گروئے کہا ”تم اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو۔ کچھ دنوں ہی کی تو بات ہے تم بھی اپنے باپ کے پاس پہنچ دیے جاؤ گے۔“ بھیس یہی ہے موت کا راز۔ یا زندگی کا راز کہ ہم کچھ عرصہ اپنی اولاد کے پاس رہتے ہیں اور پھر اپنے ماں باپ سے جا ملتے ہیں۔ ڈر کس بات کا!

## عاجزی

انسان بے بس ہے۔ بے بسی یہ ہے کہ وہ انسان ہے۔ انسان اپنے آپ میں، اپنی تخلیق میں، اپنی فطرت میں، اپنی استعداد میں، اپنے اعضا و جوارح میں، اپنے قواء میں اپنے ظہر اور اپنے باطن میں، اپنے حاصل اور اپنی محرومی میں، اپنی خوشی اور اپنے غم میں، اپنے ارادوں اور اپنی تمناؤں میں، اپنے مشاغل اور اپنی مصروفیتوں میں، اپنے احباب و اغیار میں، غرضیکہ اپنی تمام حرکات و سکنات میں ناجز و ناتواں ہے۔

انسان کا ہونا اس کے نہ ہونے تک ہے اس کا حاصل لا حاصل تک۔۔۔ اس کی آرزوئیں شکست، آرزو تک، خون آرزو تک۔۔۔ اس کی توانائی و صحت بیماری تک اور اس کی ساری تک و تاز اس کے اپنے مرقہ تک، اس کی بند پر وازی اس کی واپسی تک۔۔۔ اس کا ہر تخیل، عروج خیال، اس کے زوال تک ہی ہے۔۔۔ اس کی انا ایک بچے کے غبارے کی طرح پھولتی ہے اور پھر غبارہ پھٹ جاتا ہے اور وہ ناجز و بے بس ہو کر اس کھیل سے محروم ہو جاتا ہے۔ انسان علم حاصل کرتا ہے خود کو دوام بخشے کے لیے وہ لائبریریوں میں داخل ہوتا ہے۔۔۔ اس کے پاس کتنی کے ایام ہیں اور کتنی ان گنت۔۔۔ اس کا معلوم محدود رہتا ہے اور لامعلوم لامحدود۔۔۔ وہ تیزی سے علوم چاٹتا ہے اور فنا اس کی زندگی کو چاٹتی ہے۔۔۔ اور انجام کار اس کا انجام۔۔۔ مکمل بے بسی، مکمل عاجزی۔

انسان عروج چاہتا ہے۔ بلندی چاہتا ہے۔ پہاڑی چوٹی، اس پر ایک اور



پھاڑ رکھتا ہے۔ اس کی چوٹی پر ایک اور پہاڑ رکھتا ہے اور پھر یہ سلسلہ چلتے چلتے اس وقت تک آپہنچتا ہے جب اس کے سر کیے ہوئے سب پہاڑ، سب چوٹیاں دھڑام سے زمیں بوس ہو جاتی ہیں۔۔۔ وہ غسوس کرتا ہے تو اس کے پاس غسوس کا وقت نہیں ہوتا۔ وہ سوچتا ہے اور سوچ کر عاجز ہو جاتا ہے کہ اس نے کیا چاہا۔۔۔ اس نے کیا سوچا۔۔۔ اس نے کیا پایا۔۔۔ اس کے ہاتھ آنے والی ہر چیز اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور وہ اپنے حاصل سے نکل جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔!

وہ مکان بناتا ہے۔۔۔ خوبصورت، دیدہ زیب، آسائش و زیبائش و دل مکان۔۔۔ اس کا اپنا مکان، اس کے حسن خیال کا شہکار۔۔۔ اس کا مکان خوشیوں سے جگمگاتا ہے۔۔۔ اور پھر یہی عشرت کدہ، ماتم کدہ بنا شروع ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اس نے کیا بنایا۔۔۔ اس کا افتخار انجام کار بے بسی میں خاموش ہو جاتا ہے۔

انسان صحت کی حفاظت کرتا ہے۔ خوراک کا اہتمام کرتا ہے۔ بڑے جتن کرتا ہے۔ وہ طویل عمر چاہتا ہے اور طویل عمر نقص عمر سے دو چار ہوتی ہے۔۔۔ زندگی قائم بھی رہے تو مینائی قائم نہیں رہتی۔ سماعت ختم ہو جاتی ہے۔۔۔ پھر یہ دشت کسی صدے کا شکار ہو جاتی ہے۔۔۔ وہ زندہ رہتا ہے، زندگی لے سٹف سے محروم۔۔۔ وہ نہ بھی مرے تو اس کے عزیز، اس کے اقرباء، اس کے محبوب رخصت ہو نا شروع ہو جاتے ہیں اور اپنی زندگی میں خود کو اپنی نظروں میں بیگانہ سمجھنے لگتا ہے۔۔۔ اس کے پاس اس کی یادوں کا کوئی شریک نہیں رہتا اور پھر یہ یادیں بھول جاتی ہیں۔۔۔ اس کی پھیلی ہوئی کائنات سمٹ جاتی ہے وہ هجوم میں تنہا ہو جاتا ہے۔ اس کا سب غرور و جزو بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کا اپنا مکان اسے نکال باہر کر دیتا ہے۔۔۔ اور کچھ عرصہ بعد اس کی تصویریں دیواروں اور البموں سے ہٹا دی جاتی

ہیں۔۔۔ اور کسی کو یاد نہیں رہتا کہ وہ تھا۔۔۔ تھا بھی کہ نہیں۔۔۔!

انسان سفر کرتا ہے۔ فاصلے طے کرتا ہے۔ محدود زندگی میں لامحدود فاصلے کیسے طے ہوں۔ زمین و آسمان کا عظیم سلسلہ فاصلوں سے بھرا ہوا ہے فاصلے ہی فاصلے ہیں، راستے ہی راستے ہیں، مسافرت ہی مسافرت ہے لکھوں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چھنے والی روشنی یہ فاصلے کروڑوں سال میں طے نہیں کر سکتی، انسان کیسے طے کرے گا۔۔۔ انسان کے پاس عاجزی اور بے بسی کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا!

انسان دولت اکٹھی کرتا ہے۔ مال جمع کرتا ہے۔ اسے گنتا ہے گن کر خوش ہوتا ہے فخر کرتا ہے کہ اس کے پاس مال ہے۔ اسے جب معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کتنے قارون و فرعون گزر گئے۔۔۔ مال نے کسی کی مدد نہ کی۔۔۔ زمین میں اتنا مال ہے کہ بس خدا کی پناہ۔۔۔ کوئی کیا حاصل کرے گا۔۔۔ ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ رکھنے سے انسان کو کیا ملے گا۔۔۔ اس کے بنک بھرے رہتے ہیں اور دل خالی رہتا ہے۔ متاعِ حیات قلیل ہے۔ جوں جوں مال بڑھتا ہے، مال کی تنہا بھی بڑھتی ہے اور انسان اپنی دولت کو ضرورت سے کم سمجھتا ہے وہ اپنی امیری کو غریبی کے ڈر سے بچا نہیں سکتا۔ اگر خواہش حاصل سے زیادہ ہو تو انسان خود کو غریب سمجھتا ہے۔ خواہشات کا بے ہنگم پھیلاؤ آخر کار انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وہ اپنے ہی جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ خواہشات بدستور رہتی ہیں ہمرتی رہتی ہیں، پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

اس کھیل کا نتیجہ، لازمی نتیجہ بے بسی ہے عاجزی ہے۔ انسان کو اس کی تمنائیں عاجز کر دیتی ہیں۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ ہر نئی شے کی محبت میں گرفتار ہونا اس کا مقدر ہے۔ نئے مکان، نئے ماڈل، نئے تقاضے پورے کرتے کرتے انسان،

پرانا انسان، بے بس و عاجز ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ انجام کار دیکھتا ہے کہ اس کا پھیراؤ سمٹ گیا۔ اس کی دنیا محدود ہو گئی۔ اس کے راستے مسدود ہو گئے۔ اس کے ارادے ٹوٹ گئے۔ اس کی سکیمیں ناکمل رہیں اس کے پروگرام ادھورے رہ گئے۔ اس کے خوب پریشان ہو گئے۔ اس کے خیال کے اڑن کھنولے ہچکولے کھاتے ہوئے زمین پر آگرے۔ زندگی میں اتنی مہلت نہیں ملتی کہ انسان اس کو دوبارہ شروع کر سکے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ ہوئی، انہونی نہیں ہو سکتی۔ غرور سرنگوں ہو جاتا ہے۔۔۔ زور کمزور ہو جاتے ہیں اور محنتیں مٹی میں مل جاتی ہیں۔۔۔

عجب حال ہے۔ انسان کے مزاج میں غرور ہے اور اس کے مقدر میں عاجزی۔۔۔ لکھنے والے نے ایسے ہی لکھا ہے۔ غرور کا یہ عالم ہے کہ انسان خدا بننے کا بھی دعویٰ کرتا ہے۔ وہ سب کچھ بناتا ہے۔ عاجزی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو بے وقوف بناتے بناتے خود بے وقوف بن جاتا ہے۔

انسان اپنے مرتبے کو زریعہ افتخار بناتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ بڑا افسر ہو کر شہر بڑا انسان ہو جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عظیم انسان اپنے مرتبوں کی وجہ سے نہیں پیچھے رہ گئے ان کا کردار انہیں عظیم بناتا ہے۔ کردار میں غرور کو سب سے برا کہا گیا ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے کہ اے انسان! تجھے کس بات نے اتنا مغرور کر رکھا ہے کہ اپنے رب کریم کو بھول گیا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ وہ وقت آنے والا ہے، جب انسان کو لک کے رو برو پیش کیا جائے گا۔

انسان اور خاص طور پر آج کا انسان ایک سطحی اور نقلی زندگی بسر کر رہا ہے وہ

اندر سے ٹوٹ چکا ہے اس کو عجیب قسم کے خدشات نے گھیر رکھا ہے وہ اپنے آپ سے، اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکا ہے۔ وہ اپنے لبادے سے باہر نہیں نکلتا۔ اس نے صرف اپنے آپ کو خود سے چھپا رکھا ہے۔ وہ اپنی کامرانوں کا اعلان کر کے دوسروں کو دھوکہ دیتا ہے اور اصل میں خود دھوکہ کھا جاتا ہے اس کا غور ہی اس کی بے بسی کا اعلان ہے۔ وہ جتنا عاجز محسوس کرتا ہے خود کو، اتنا ہی خود کو قوی ہوتا ہے۔

اس کا ارتقاء، اس کی ترقی، اس کی ترقی پسندی، اس کی خود گریزی کے ابواب ہیں وہ اتنا مصروف رہتا ہے کہاں کے پاس اپنے لیے۔ اپنے وطن کے لیے فرصت نہیں۔ وہ ایک ایک کی طرح زندگی کے سٹیج پر آتا ہے، بڑے بڑے مکالمے بولتا ہے، لوگوں کو متاثر کرتا ہے اور دوسروں کے لیے سٹیج خالی کر کے اپنی بے بس تنہائی میں چھا جاتا ہے۔

انسان کے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں، اس کا علم تو خالق کے پاس ہی ہو سکتا ہے، انسان کو عقل عطا کرنے والی ذات عقل کے صحیح استعمال کی توقع رکھنے میں حق بجانب ہے۔ خالق انسان سے تدریس اور تفکر چاہتا ہے۔ وہ انسان سے کہتا ہے کہ آؤ آؤ لوگوں والے انسان! دیا کی سیر کر اور دیکھ ان لوگوں کی عبرت جو جھوٹے تھے، دیکھ ان لوگوں کا انجام جو مغرور تھے، دیکھ ان کی عاقبت جو خدا فراموش رہے، دیکھ ان لوگوں کا حسرت بھرا حاصل جو باغی تھے، دیکھ کہ وہ کس طرح ایک عذاب کی لپیٹ میں آ گئے۔

خالق چاہتا ہے کہ انسان غور کرے۔ اتنا غور کرے کہ وہ اپنی ہستی کا راز دریا منت کرے۔ انسان کو دعوت ہے کہ وہ غور کرے کہ اتنے پہاڑ کیسے معرض وجود میں آ گئے۔ اتنے گہرے سمندر، اتنے وسیع صحراء، اتنے بلند آسمان بغیر ستونوں کے



انسان اپنی ہستی کو خالق کا احسان سمجھ کر قبول کرے تو اس کی سہمستی ہے کسی کے احسان کو اپنا استحقاق نہ بنائے تو غرور نہ پیدا ہوگا۔ اس کا ہر حاصل عطا ہے اور اس کا ہر دعویٰ خطا ہے۔ سوائے ایک دعویٰ کے کہ وہ ناتوان و بے بس و عاجز ہے۔ تکبر خالق کو، لک کو زیب دیتا ہے۔ مخلوق اور مملوک کے لیے عاجزی و انکساری باعث رحمت و برکت ہے!!!



## لب پہ آسکتا نہیں

آنکھ سے گزرنے والا ہر جلوہ بیان میں نہیں آسکتا جب آنکھ محو نظر رہے ہو، تو بیان ممکن نہیں ہوتا اور جب نظاری رخصت ہو جائے تو صحت بیان مشکوک سی ہو جاتی ہے اور بیان اپنی صداقت کے باوجود یقین اور بد اعتمادی کے مے مے جیسے جذبات پیدا کرتا ہے۔ ویسے بھی دیکھے ہوئے اور سنے ہوئے منظر میں فرق رہتا ہے۔

آنکھ اگر آنے والے دور کو دیکھے۔ تو اس کا بیان سامعین کے لیے الجھاؤ کا باعث ہو سکتا ہے۔ آنے والے زمانے کو کس نے دیکھا؟ سچ ہے۔ آنے والے ناغائب ہے اور غائب اگر نظر میں ہو تو تب بھی محو نظر ہے۔

آنے والے ایام آخر جانے والے ایام سے ہی تو جنم پیتے ہیں۔ اگر حال کو غور سے دیکھا جائے تو استقبال کو قبل از وقت دیکھا جاسکتا ہے۔

اگر کوئی بوڑھا شخص بیمار رہنے لگ جائے تو مستقبل کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا۔ اگر جوانوں میں ہیروئن کا شوق اور عادت پیدا ہو جائے تو قوم کا مستقبل صاف ظاہر ہے۔

اگر طالب علم، علم کا طالب نہ رہے تو نتیجہ واضح ہے۔

اگر قافلہ کسی کو سالار ہی نہ مانے تو سفر گمراہی کی دلیل ہے۔ قافلے کی منزل وقت سے پہلے عیاں ہے۔

اگر میاں بیوی کے درمیان انا کے مقابلے اور مناظرے شروع ہو جائیں تو

اس گھر اور گھر کے افراد کا حشر غائب کا علم نہیں کہلاتا۔

اگر خوراک میں ملاوٹ شروع ہو جائے تو صحت کے بارے میں یہ مینار منعقد کرنا بیکار ہے۔ صحت کا علم وقت سے پہلے معلوم ہو سکتا ہے۔

اگر رشوت لینے والے محفوظ مرتبوں پر فائز ہوں تو مستقبل۔۔۔ کیسے مستقبل!

اگر چوکیدار ہی چوری کرنے لگ جائیں، اگر باڑی کھیت کو کھانے لگ جائے، اگر ایہاڑی غیر جانبدار نہ رہیں تو مستقبل عیاں ہوتا ہے۔

اگر کسی کو کسی پر اعتماد نہ ہو، اگر کوئی کسی کے لیے بے ضرر نہ ہو، اگر ہر شخص کو ہر دوسرے شخص پر، اس کی نیت پر شبہ ہو، اگر انسان اپنے آپ سے بے زار ہو، اگر الفاظ اپنے معنی سے جدا ہو جائیں تو مستقبل کے بارے میں جاننا غیب کی بات نہیں، ظاہر کا علم ہے۔ اگر سیاست اختلاف برائے اختلاف پر مبنی ہو تو سیاسی استحکام کا مستقبل آشکارا ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں اور اسی طرح کی کئی باتیں، ظاہر ہے ہر وی شعور کے لیے اپنے اندر آنے والے زمانوں کی خبر رکھتی ہیں۔

کبھی کبھی حالات حاضرہ کے مشاہدے کے بغیر بھی مستقبل اپنے آنے کی قبل از وقت اطلاع دیتا ہے۔ اقبال نے کہا کہ ”محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی“ تو اس خبر کا تعلق حال سے قطعاً نہیں۔ یہ الگ اطلاع ہے۔ اس کا تعلق نظر سے ہے۔

مقام خبر اور مقام نظر کا فرق تو صرف اہل باطن ہی معصوم کر سکتے ہیں۔ اہل باطن کی نظر میں اپنے زمانے کے علاوہ بھی زمانے ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ

وجوہات اور نتائج کے رشتے انسانی رشتوں کی طرح ہمیشہ قائم نہیں رہتے۔ بعض اوقات وجہ کچھ اور ہوتی ہے اور نتیجہ کچھ اور۔

بے سبب نتائج کی خبر ہی نظر کہلاتی ہے۔ صاحب نظر نقیب فطرت ہوتا ہے۔ فطرت اسے جو کچھ دکھاتی ہے، وہ اسے بیان کرتا ہے۔ وہ صاف صاف بیان کرتا ہے، لیکن سننے والے سمجھ نہیں سکتے۔ سامعین حیران ہوتے ہیں کہ اس نے کون سا خبر پڑھ لیا ہے یہ شخص بہک تو نہیں گیا۔ لیکن نہیں۔ وہ بہکت نہیں۔ فطرت نہ کہنے والوں کے ذریعہ سے کوئی پیغام نہیں بھیجتی۔ یوں بھی جاننے والوں اور نہ جاننے والوں میں فرق رہتا ہے۔ اسی طرح جس طرح جاننے والوں اور سونے والوں میں فرق ہے۔

ہر دور میں جاننے والوں نے نہ جاننے والوں کو اپنے علم سے متعارف کرایا ہے۔ سننے والوں کو یقین آئے نہ آئے، یہ الگ بات ہے۔

فی الحال اس سے بحث نہیں۔ یقین اگر اہل نظر کی بات کی تصدیق سے پہلے آئے تو بہتر، ورنہ بیکار۔ اگر حادثہ گزر جائے تو یقین کا فائدہ ہی کیا؟ مثلاً اگر کوئی بتانے والا یہ بتائے کہ سانپ آ رہا ہے تو اس سے پہلے کہ بتانے والے کی تحقیق کی جائے، بہتر یہی ہے کہ سانپ کا تدارک کر لیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ خبر صحیح تھی یا غلط۔۔۔ دونوں حالتوں میں ہم محفوظ رہتے ہیں!

اگر ہم مسلمانان پاکستان اپنی حالت کا مسلمانان عالم کے پس منظر میں جائزہ لیں تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ آئیے غور کریں کہ دنیا کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے۔

ہندوستان کے مسلمان کس حال میں ہیں؟ وطن میں غریب الوطن!

ایران کس حال سے گزر گیا عراق کس حال میں ہے اور ہمارا پڑوسی مسلمان افغانستان کس صورت حال سے دوچار ہے؟ لبنان، فلسطینی مسلمان، امریکہ کے مسلمان۔ سب پر کیا مسلط ہے۔

ہمیں اپنی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ہم ایک خطہ امن بنے ہوئے ہیں۔۔۔ ہم گوشہء صافیت میں ہیں۔۔۔ سوال یہ ہے کہ کیوں اور کب تک؟

ہم میں کیا خصوصیت ہے؟ کیا ہم بہت ہی لاڈلے ہیں؟ ہماری حالت ہرقی مسلمانوں کی حالت سے مختلف کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری ہاری آنے والی ہو اور ہم بے خبر اپنے حال میں لگن ہوں۔۔۔ بس یہی ہے وہ خبر، جیسے نظر کہا جاسکتا ہے!!

اب ہمارا عمل بدلنا چاہیے، ورنہ ہم بھی کسی ناخوشگوار واقعہ کی نظر ہو سکتے ہیں۔

دنیا میں زلزلے آ رہے ہیں اور ہم بھی دنیا میں رہتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو، لیکن ایسے ہو تو سکتا ہے۔

خدا نہ کرے کہ کوئی جنگ ہو۔ لیکن ہر روز کی خبریں، بار بار جنگ کے امکانات کا ذکر۔۔۔ جھوٹ ہو اللہ کرے۔۔۔ لیکن اگر سچ ہو تو؟ اندرونی خفشار طاقت نے دبا رکھا ہے۔ اگر خدا نہ کرے کوئی لاوا ابل پڑے۔۔۔ تو۔۔۔ کیا ہوگا؟

ہماری سرحدوں کی حالت تشویشناک نہیں، لیکن تسلی بخش بھی تو نہیں ایسی

حالت میں کچھ بھی کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ اللہ کرے کہ ایسا نہ ہو، لیکن ہو تو سکتا ہے!

آنے والے زمانہ جانے والے زمانے سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ غور کیا جائے۔۔۔ اگر ہمارے ساتھ خدا نخواستہ کوئی ایسا ویسا واقعہ یا حادثہ ہو گیا، تو ہمارے لیے جائے مفر نہیں۔ ہم ہر طرف سے محصور ہیں۔

ہمیں اپنے دامن میں ایسا کام بھی تو نظر نہیں آتا، جس سے ہم کسی ناگہانی سے محفوظ رہنے کا حق حاصل کریں۔ ہمیں اللہ پر بھروسہ ہے اور اللہ سب مسلمانوں کا بھی تو اللہ ہے اب مستقبل کا دار و مدار صرف اخوت پر ہی ہو سکتا ہے اور شومئی قسمت کہ ہم میں خوت ہی تو نہیں۔

ہمیں صرف گفتگو، لائحہ عمل، صرف بیانات سے آگے نکلنا چاہیے ہمیں علم سے نکل کر عمل کے میدان میں اترنا چاہیے۔ وحدت عمل، وحدت کردار۔۔۔ یہی اور صرف یہی ہمارے لیے راہِ نجات ہے۔

شعر مرثیہ اسلامیہ اقبال نے جب یہ کہا کہ

ع

وطن کی فکر کرنا، مصیبت آنے والی ہے

تو اس کا مخاطب کوئی بھی زمانہ ہو سکتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ ہمارا ہی زمانہ ہو۔ ہل نظر شہر کی نگاہ سے زمان و مکاں کے حجابات اٹھ چکے ہوتے ہیں وہ اپنے زمانے سے کسی بھی زمانے کو کوئی سا پیغام دے سکتا ہے۔ اقبال دیکھ رہا تھا، آنے والوں کو۔۔۔ جانے والوں کو۔۔۔ اقبال کی زبان سے بولنے والی کوئی بھی ذات ہو سکتی ہے۔

اقبال خود کہتا ہے:

ع نکلے تو لبِ اقبال سے ہے نہ جلے ہے یہ کس کی صدا

تو۔۔۔ غور کا مقام ہے۔۔۔ بڑے غور کا مقام ہے

ہمارے اندیشے اتنے بے سبب بھی نہیں۔ آنے والا دور اتنا خوشگو رہی نہیں کہ ہم غفلت میں ہی اس کا انتظار کریں۔

ہو سکتا ہے۔۔۔ اور بہت لچھ ہو سکتا ہے!!

اگر اینٹوں میں وحدت نہ رہے تو دیوار اپنے بوجھ سے گر بھی سکتی ہے۔

تقریریں، مذہبی اور سیاسی، صرف تقریریں، صرف خطابات، بیانات اور صرف الفاظ سے قوم کی تاریخ مستحکم نہیں ہوا کرتی۔ قومیں عملِ بہیم سے بنتی ہیں۔ ہمارا قومی عمل کیا ہے؟ ہم جس درخت کے سائے میں بیٹھے ہیں، جس کا پھل کھا رہے ہیں، اسی درخت کی قدر نہیں کرتے۔ اس کی حفاظت کے لیے متحد نہیں ہوتے۔ ہم کیا کرتے ہیں؟

اگر سورج کی کرنیں سورج ہی کو چاٹ لیں تو کیا ہوگا؟ اگر الفاظ کی بے معنی کثرت الفاظ کی حرمت ختم کر دے تو کیا ہوگا؟ اگر مساجد کی تعداد بڑھ جائے اور نمازیوں کی تعداد کم ہو جائے تو کیا ہوگا؟

اگر قوم میں قوتِ بازو بھی نہ ہو اور قوتِ ایمان بھی نہ ہو تو کیا ہوگا؟

اگر آدھا رستہ طے کرنے کے بعد مسافر بد دل ہو جائیں تو کیا ہوگا



؟۔۔ آگے جانے کا عزم نہ رہے اور پیچھے کو لوٹنا ممکن نہ ہو تو کیا ہوگا؟

اگر زمین پر گناہوں کا بوجھ بڑھ جائے۔۔۔ اگر مکان اپنے مکینوں سے  
نالہ ہوں۔۔۔ اگر انسانوں کا اپنا باطن ان کے اپنے ظاہر سے پریشان ہو،  
۔۔۔ تو کیا ہوگا؟

اگر شاعر، ادیب، دانشور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں تو ملکی  
اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا؟

اگر ہم آپس میں مہربان نہ ہوں، تو دشمن کے مقابلے میں متحد کیسے ہوں  
گے؟

اگر ملی کو دیکھ کر بوتر آنکھیں بند کر لے۔۔۔ تو کیا ہوگا؟ اگر سچے دین کی  
تبلیغ کرنے والے خود سچے ہوں تو تبلیغ کی تاثیر کیا ہوگی؟

اگر غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کا ذکر کرنے والے اپنے لوگوں کے  
ساتھ بد سلوکی کریں۔۔۔ تو نتیجہ کیا ہوگا؟

اگر غفلت اور خوش فہمی اور خوش اعتمادی کی وجہ سے ایک دفعہ ملک ٹوٹ چکا  
ہو اور قوم کے مزاج اور عمل میں فرق نہ آیا ہو۔۔۔ تو غور کا مقام ہے۔

اگر۔۔۔۔ اور یہ بہت بڑا اگر ہے۔۔۔ کہ

اگر دین خوشنودی و رسول اور خوشنودی خدا کا نام ہو اور خدا اور مصطفیٰ ہم پر را  
ضی نہ ہوں۔۔۔ تو۔۔۔ ہم کدھر جائیں گے؟

اب اس مقام پر کسی پیش گوئی اور کسی بحث کے تکلف کی ضرورت نہیں رہتی۔

یہ ابتلا کا وقت ہے۔

کیا ہم غور کرنے کی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں؟

کیا ہم ماضی سے سبق حاصل کر سکتے ہیں؟

کیا ہم دوسرے مسلمان ممالک سے سبق حاصل کر سکتے ہیں؟

کیا ہم ایک دوسرے کو معاف کر سکتے ہیں؟

کیا ہم ایک دوسرے سے معافی مانگ سکتے ہیں؟

کیا ہم حق بات کہنے کی جرات کر سکتے ہیں؟

کیا مشخ اکرام واقعی متحد ہو سکتے ہیں؟

کیا علماء ایک مسلک پر متفق ہو سکتے ہیں؟

کیا سیاست دان بچ اور صرف بچ بول سکتے ہیں؟

کیا طاقت، خوف کی بجائے محبت پیدا کر سکتی ہے؟

کیا آج کے بچوں کو آنے والے زمانوں کے خوشگوار ہونے کی گارنٹی دی جا سکتی ہے؟

کیا آئندہ کسی ٹوٹ پھوٹ کے نہ ہونے کا یقین ہو سکتا ہے؟

کیا ہم پرانے زخموں کے لیے مرہم تیار کر رہے ہیں یا کسی نئے زخم کا انتظار کر رہے ہیں؟

اس سے پہلے کہ ہم پر رحمت اور توبہ کے دروازے بند ہوں، کیا ہم اپنی فکر اور زندگی کو بدل سکتے ہیں؟

کیا ہم دشمن کی چال سے بے خبر ہیں؟۔ دشمن کی اصل قوت دوستوں کی جدائی میں ہے۔ کیا ہم اتنا اسلام بھی نہیں رکھتے، جتنا قائد اعظمؒ کے پاس تھا؟ اس صاحبِ ایمان کے پاس صرف صداقت تھی، جذبہ تھا، دیانت تھی، خلوص تھا۔ بس یہی کچھ تو تھا انہوں نے نہ کسی سے کلمہ سنا، نہ کسی کو قرآن سنایا۔ انہوں نے صرف مسلمانوں کے لیے، ان کی فلاح کے لیے، ان کی اپنی حکومت کے لیے، ایک مملکت بنا کر دیکھ دی۔ عجز ہے۔۔۔ اور ہم اس مملکت میں کیا کیا کر چکے ہیں۔۔۔ کیا کیا کر رہے ہیں۔ ہم یقیناً جواب دہ ہیں۔ شہدائے وطن کے سامنے، خدا کے سامنے، اور پھر حضورؐ کے سامنے! بات علم کی نہیں، عمل کی ہے، خالص عمل۔۔۔ ہم سب ایک کشتی میں سوار ہیں، ایک امت ہیں، بحث کی ضرورت نہیں۔۔۔ غور کا مقام ہے۔۔۔ دعا کی گھڑی ہے۔۔۔ کہ خدا کرے کہ وہ واقعہ ہی ٹل جائے۔۔۔ جس کا ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ وہ واقعہ ہی ایسا ہے کہ لب پہ آسکتا نہیں۔

## یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر

انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی آزاد اور لا تعلق ہو، پابند اور متعلق رہتی ہے۔ انسان دوڑتا ہے لیکن فاصلوں کی حدود میں۔ انسان اڑتا ہے اور خلا کی پہنائیوں کے اندر وہ ارض و سماوات کے اندر ہی رہتا ہے۔ انسان جب کسی طاقت کو نہیں مانتا وہ اس وقت بھی اپنے انکار کی طاقت کے ماتحت ہوتا ہے۔ انسان کی خوشیاں تمام تر مسرتیں، کسی نہ کسی غم کی زد میں ہوتی ہیں۔ ہر غم خوشی بن کر آتا ہے اور ہر خوشی غم بن کر رخصت ہو جاتی ہے۔ بس خوشیوں نے رخصت ضرور ہوتا ہے۔ پیاری پیاری، اپنی بیٹیوں کی طرح۔۔۔ کیا کیا جائے!

انسان شب و روز کے حصار ہی میں جکڑا ہوا سا ہے۔ وہ صدیوں سے اس جال کو توڑنا چاہتا ہے۔ زمان و مکاں توڑ کر نکل جانا چاہتا ہے۔ نکل کر کہاں جائے گا۔۔۔ ہم دنیا سے بھاگ سکتے ہیں، لیکن اپنے آپ سے کون بھاگ سکتا ہے۔ انسان اپنے اپنے نچے میں ہے۔ وہ خود گریز بھی، خود پرست و خود مست بھی ہے، خود بین و خود کلام ہے، خود نگر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود ممکن ہے۔

اس کے اپنے وجود میں اس کے لیے کچھ بھی تو موجود نہیں۔ سب کچھ ہے، لیکن کچھ بھی نہیں۔

انسان شاید سمجھتا نہیں کہ وہ اپنی صفات، حیات، اپنی عادات، لذات، شہوت و حیوانیات، عبادات و اعتقادات کا مرقع ہے۔ اس پر گردش زمان و مکاں کے علاوہ بھی کئی گردشیں گزر جاتی ہیں۔ اس پر روزگار زمانہ کے علاوہ بھی کئی زمانے آتے ہیں۔۔۔ موسم بہار کے علاوہ بھی کئی بہاریں آتی ہیں۔ اس کے اپنے اندر کبھی

پھول کھلتے ہیں، کبھی بول مسکراتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ روشنی و تیرگی کے، دوار سفر کرتے ہیں۔۔۔ اس کا شعور آزادی کا شعور، اس کا اپنا نہیں۔۔۔ وہ اپنے ماضی سے کٹ نہیں سکتا، اپنے مستقبل سے ہٹ نہیں سکتا۔۔۔ اس کا حافظہ، اس کا متخیل، اسے آزادی کا شعور عطا کر کے اسے پابند کر دیتے ہیں۔

انسان اپنے آپ پر غور کرتا ہے۔ اسے اپنے اندر ایک جہاں نظر آتا ہے۔ وہ اپنی مینائی کو دیکھتا ہے۔ لطف اندوز ہوتا ہے نظاروں سے۔۔۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ مینائی دینے والی طاقت نے ہی نظارے پیدا کیے ہیں۔۔۔ اب یہی آزاد نگاہ انہی نظاروں کی پابند ہو کر رہ جاتی ہے۔ انسان وہ چیز نہیں دیکھ سکتا جو نہیں ہے۔۔۔ وہی مناظر جو صدیوں سے دیکھے جاتے رہے ہیں، وہی سیارے و ستارے، وہی شمس و قمر، وہی مشرق و مغرب، اور وہی کوہ و صحرا، قلم و دریا، وہی بادل، وہی فضا میں، وہی ہوائیں، وہی موسم، وہی پرانے غم اور پرانی خوشیاں۔۔۔۔

نیا انسان نئی مینائی اور نئے عزائم کے ساتھ پرانے مناظر دیکھتا ہے۔ اس کے سامنے جو جلوہ موجود ہے، وہ اس سے پہلے بھی موجود ہے اور اس کے بعد بھی موجود رہے گا۔ آزاد اور جدید انسان نے بڑی پابندی سے پرانے نظارے ہی دیکھنے ہیں نگاہ کی آزادی اپنے اندر ایک حد تک آزاد ہے۔ دیکھنے والا ایک حد کے بعد نہیں دیکھ سکتا۔ یہ حد کبھی فاصلوں کی شکل میں ہے، کبھی عمر کے حساب سے ہے۔ آج کی مینائی شاید کل، آج ہی کی طرح نہ آ سکے۔ جہاں گلاب کھلتے تھے، وہاں ان آنکھوں میں موتیا کھلے گا۔ آج کا لطف شاید آئندہ نہ مل سکے۔ آج کا احساس شاید آج تک ہی ہو۔۔۔ محفل کی گرمیاں تنہائیوں میں بج ہو جاتی ہیں۔

آج کی حقیقت کل کا افسانہ ہوگی۔ انسان آزاد ہے کہ جو چہرہ چاہے پسند



کر لے لیکن اس نے صرف ایک ہی چہرے سے محبت کرنا ہے اور یہاں آزادی  
آزاد نہیں رہتی۔

انسان کے سامنے پھیلی ہوئی کائنات اس کو بہت ہی وسع نظر آتی ہے اور اس کائنات کے اندر اسے اپنے لیے امکانات لامحدود نظر آتے ہیں۔۔۔ امکانات لامحدود ہی رہتے ہیں۔۔۔ لیکن فیصلے کے لمحے میں یہ سارے لامحدود امکانات ایک مختصر اور محدود فیصلے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان سمجھتا نہیں ہے

زندگی کی وسع شاہراہیں آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی سڑکوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور یہ یہ سڑکیں نہ جانے کیسے بند گلیوں میں بدل جاتی ہیں اور امکانات کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور پھر وہی انسان سمند طغوت سے گرتا ہوا زمین پر آ رہتا ہے وہ سوچتا ہے کہ یہ سب کیا تھا۔۔۔ کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا، لیکن بس یہی کچھ ہو۔ اگر یہی کچھ تھا تو یہی کچھ کیوں نہ تھا۔۔۔ وہ سب کچھ کیا تھا، جواب نہیں ہے۔

اپنی قوت پر گھمنڈ کرنے والا اپنے عجز پر شرمندہ تو ہوتا ہے، لیکن اپنی شرمندگی پر مزید عاجز ہوتا ہے۔ اس کی قوت اپنے اندر ہی دم توڑ جاتی ہے۔ قوا تو مضمل ہو ہی جاتے ہیں۔ عناصر میں اعتدال تو غالب کو بھی نہ ملا۔۔۔ کسی کو نہیں۔۔۔ سب کیساتھ ایسا ہوتا آیا ہے۔ اپنے آپ میں مکن رہنے والا، خوش باش، بے فکر نو جوان ایک دن اداس ہو جاتا ہے۔۔۔ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔۔۔ صرف اس کا کوئی بہت ہی قریبی عزیز فوت ہو گیا۔ وہ سوچتا ہے، عجیب بات ہے۔۔۔ مرنے والا رخصت کے وقت عجیب تحفہ دے گیا، غم دے گیا خوشی لے گیا۔ اب یہ غم امانت ہے مانگے بغیر ملتی ہے۔ ہماری آزادی کے چار تنکوں پر یہ برق آسانی نازل ضرور ہوتی ہے۔۔۔ ایسے کیوں ہوتا ہے۔ بس یہی تو بے بسی ہے کہ جو بات و نتائج



سے باخبر انسان بھی اس سے بے خبر رہتا ہے کآ خزانے والے جاتے کیوں ہیں اور اگر جانا ہی ہے تو آنا کیوں ہے!!

انسان کا علم، جدید علم بھی آج کے اخبار کی طرح کل کی خبریں دیتا ہے  
انسان جیسے تازہ سمجھ رہا ہے، وہ کہہ رہا ہے۔۔۔ یہ جواں سورج بہت ہی بوڑھا ہے۔۔۔  
یہ ماہتابی چہرہ صرف دور سے دیکھنے والا ہے۔ یہ حسین و جمیل ستارے، بس اپنی نظر کا  
دھوکا ہے۔۔۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آگہی بھی فریب آگہی سے زیادہ نہیں۔۔۔ انسان  
ایک خاص وقت میں مقرر شدہ لمحے میں پیدا ہوتا ہے اور پھر ایک اور مقرر شدہ لمحے  
میں رخصت ہو جاتا ہے۔ ان دو نقطوں کے درمیان آزادی کا سفر ہے۔ امکانات  
اور حاصل کا سفر ہے۔۔۔ ساٹھ سال کی طویل عمر میں بیس سال نیند کی نذر ہو جاتے  
ہیں۔ مجبوری ہے۔۔۔ بچپن اور بڑھاپا اور بیماری کے ایام نکال دئے جائیں تو  
انسان کے پاس اپنا کیا رہتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ آدمی زندگی سچ کر باقی کی زندگی  
کو پالنا ہے۔ فطرتوں کی نظر ہونے والی زندگی بیک چکی ہے۔۔۔ انسان کے پاس  
اپنے لیے چند سال رہ جاتے ہیں اسی مختصر عرصے میں انسان نے سب کچھ کرنا ہے۔  
بس کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ دیکھتا ہے۔ کہ سفر ختم ہو چلا ہے اور دامن مراد خالی ہے۔ وہ  
پھر دیکھتا ہے، اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کا اپنا نہیں تھا۔ وہ خود بھی اپنا  
نہیں تھا۔ اسے بھیجنے والے نے اسے اسی کام کو بھیجا کہ جاؤ اور پھر جاؤ۔۔۔ وہ اپنے  
خالی دامن میں رضا کے پھول بھرتا ہے اور پھر پکارا اٹھتا ہے۔

ع اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

**The End** ..... ختم شد